طلوعِ اسلام

اِدارۂ طلوعِ اسلام کراچی

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

کراچی

ٹیلیفون نمبر:- ۴۱۴۸۸

بدلِ اشتراک: سالانہ آٹھ روپے۔ ہندوستان سے سالانہ آٹھ روپے۔ غیر ممالک سے سالانہ ۲۰ شلنگ

قیمت فی پرچہ:- پاکستان سے بارہ آنے، ہندوستان سے بارہ آنے

نمبر ۳	اپریل سنہ ۱۹۵۶ء	جلد ۹

فہرست مضامین

صبح تک وہ بھی نہ چھوڑی تو نے...... ۳—۵
تربیتی مرکز ۶
لمعات ۸—۱۲
۲۳ مارچ ۱۳—۲۳
مجلس اقبال ۲۴—۳۳
قرآنی معاشرہ ۳۴—۴۹
اسلام کی سرگذشت ۵۰—۵۵
حقائق و عبر ۵۶—۵۸
نقد و نظر ۵۹—۶۹
اشتہارات

دفتر کا پتہ:- ۱۵۹/۱ بلاک ۳ پی۔ ای۔ سی۔ ایچ۔ سوسائٹی کراچی

صبح تک وہ بھی نہ چھوڑی تو نے اے بادِ صبا
یادگارِ رونقِ محفل تھی پروانے کی خاک

اگست ۱۹۴۷ء میں جب میں پہلی مرتبہ کراچی آیا تو موٹر گاڑی، ٹریمے اور عام راہروؤں کی زبانی متعدد بار "سعید منزل" کا نام سنائی دیا معلوم ہوا کہ وہ کراچی کے ایک قدیمی ڈاکٹر کا مکان ہے اور بہت مشہور، رفتہ رفتہ مکان کے ساتھ مکین کا نام بھی کانوں تک پہنچا لیکن عجیب متضاد خصوصیات کے ساتھ۔ "ڈاکٹر سعید! ڈاکٹر تو بہت قابل ہے لیکن بڑا بدمزاج ہے"۔ "اس نے کراچی کے مسلمانوں کی فلاح و بہبود میں بڑا حصہ لیا ہے۔ لیکن بڑا سخت اور کرخت ہے!" "بڑا مخیر ہے لیکن بڑا ہی بدلحاظ ہے" "بڑا دیانتدار ہے۔ لیکن کچھ مذہبی سا آدمی ہے": وغیرہ وغیرہ۔

غالباً ۱۹۴۸ء کا ذکر ہے۔ ایک شام میرے دروازے پر دستک ہوئی۔ باہر آ کر دیکھا۔ تو ایک معمّر بزرگ ہیں۔ سرو قامت، چھریرا بدن (کمر نہیں بلکہ) شانوں کے درمیان خفیف سا جھکاؤ۔ سادہ لباس۔ ہاتھ میں طلوعِ اسلام کا پرچہ۔ کہا کہ میں پرویز صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا پرویز میرا ہی نام ہے۔ اندر تشریف لے آیئے۔ کہنے لگے۔ "تمہارے مکان میں باہر صحن ہے، صحن میں درخت ہیں، ہوا نہایت لطیف اور پاکیزہ ہے۔ قدرت نے تمہیں یہ کچھ دے رکھا ہے۔ اور تم ہو کہ کمرے کے اندر بند ہو اور مجھے بھی وہیں بلاتے ہو۔ باہر بیٹھو"۔ اس ڈانٹ کی تلخی میں کچھ ایسا خلوص اور شفقت، سادگی اور یگانگت تھی کہ میں بےساختہ مسکرا دیا۔ اور ایک لفظ کہے بغیر باہر آ بیٹھا۔ کہنے لگے۔ میری مذہبی تعلیم تو کچھ ہے نہیں لیکن مذہب کے متعلق ہمیں جو کچھ بتایا جاتا ہے اس نے مجھے کبھی اپیل نہیں کیا۔ میرے دل نے کبھی نہیں مانا کہ وہ خدا کی طرف سے دیا ہوا مذہب ہو سکتا ہے۔ اس رسالہ میں میں نے تمہارا ایک مضمون دیکھا ہے۔ جس نے پہلی بار مجھے مذہب کی طرف کھینچا ہے۔ معلوم ہوا کہ تم کراچی میں ہو۔ اس لئے میں نے چاہا کہ تم سے براہِ راست باتیں کی جائیں۔ یہ ہے میرے آنے کا مقصد۔ (کم و بیش ان کے یہی الفاظ تھے۔ بجز اس کے کہ انہوں نے پنجابی زبان میں بات کی تھی اور "تسیں" کہا تھا جو آپ اور تم دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے)

یہ تھی ڈاکٹر سعید صاحب سے میری پہلی ملاقات۔ اس کے بعد یہ سلسلہ آگے بڑھا۔ اور جوں جوں میں ان سے قریب ہوتا گیا میری حیرت بڑھتی گئی کہ لوگوں نے اس شخص کے متعلق کیا رائیں قائم کر رکھی ہیں۔ اور یہ درحقیقت ہے کیا! اتنا بلند انسان اور ایسا صاف و شفاف مسلمان!۔ اس دور میں اس انداز کے انسان بہت کم دکھائی دیں گے۔ جس چیز کو سطح بیں لوگوں نے بدمزاجی اور کرختگی سمجھ رکھا تھا۔ وہ درحقیقت ان کی بےپناہ اصول پرستی اور بے رو رعایت حق گوئی اور انصاف

پڑ رہی تھی۔ جسے انہوں نے غصہ اور سختی یا ڈانٹ ڈپٹ قرار دے رکھا تھا۔ وہ در اصل انتہائی کرب والم کی چیخ تھی جو انسانیت کی زبوں حالی پر ان کے دل پُردرد کی گہرائیوں سے ابھرا کرتی تھی۔ وہ درحقیقت اقبال کے اس "مرد بزرگ" کی چلتی پھرتی تصویر تھے جس کے متعلق اس نے کہا ہے کہ

اس کی نفرت بھی عمیق اس کی محبت بھی عمیق قہر بھی اس کا ہے اللہ کے بندوں پہ شفیق

لوگوں کی سطحی نگاہیں جو جلاد کی چھری اور ڈاکٹر کے نشتر میں بہت کم امتیاز کرتی ہیں۔ اس مرد بزرگ کے آہنی پیکر کو دیکھتی تھیں لیکن اس کے اندر چھپے ہوئے سوز و گداز، درد و داغ۔ غم والم اور شفقت و محبت سے بھرے ہوئے قلب حساس کو نہیں دیکھتی تھیں۔ یہ مرد بزرگ اس حقیقت کی زندہ تفسیر تھا۔ کہ

تنے پیدا کن از مشتِ غبارے تنے محکم تر از سنگیں حصارے

درونِ او دلِ دردآشنائے چو جوئے در کنارِ کوہسارے

باقی رہی ان کی لامذہبیت "سو پہلے دن جب قرآن کا دیا ہوا صحیح دین ان کے سامنے آیا۔ اس وقت سے زندگی کے آخری سانس تک وہ اس کے والہانہ شیدائی رہے۔ اور انہوں نے عمر کا آخری حصہ اس دین کے سمجھنے ۔ اور اسے دوسروں تک پہنچانے میں صرف کر دیا۔ قرآن ہی کا یہ رشتہ تھا۔ جس کی وجہ سے ان کے میرے ساتھ اس قسم کے تعلقات پیدا ہو گئے کہ انہوں نے میرے اور میرے متعلقین کے عوارض اور ان کی وجہ سے پیدا ہونے والی پریشانیوں کو قاطبۃً اپنے سر لے لیا۔ اور اس خود عائد کردہ ذمہ داری کو اپنی ضعیفی اور خرابیٔ صحت کے باوجود اس مردانہ ہمت سے پورا کرتے رہے۔ جس کی مثال بمشکل ملے گی۔ انہیں اپنے آرام اور سکون کا کوئی خیال نہیں ہوتا تھا۔ ہمیشہ اسی کی فکر رہتی تھی کہ مجھے آرام اور سکون کس طرح مل سکتا ہے۔

اتوار کی صبح وہ بالالتزام میرے ہاں تشریف لے آتے۔ میرے گھر میں ان کا مقام بزرگ خاندان کا سا تھا۔ اس لئے وہ تمام افرادِ خانہ کی دیکھ بھال کرتے۔ بچوں سے بالخصوص انہیں بڑی محبت تھی ان کے لئے وہ اپنی جیب میں ہمیشہ ٹافیاں رکھتے تھے۔ اس فریضے سے فارغ ہونے کے بعد وہ اطمینان سے مکان کے صحن میں نیم کے درختوں کے سایہ تلے بیٹھ جاتے۔ اور قرآن کے متعلق مختلف باتیں پوچھنا شروع کر دیتے۔ رفتہ رفتہ اور ملنے والے بھی اس نشست میں شریک ہونے لگے۔ اور اسی نجی نشست نے بالآخر سے ہفتہ واری خطبات قرآنیہ کی شکل اختیار کر لی۔ جو اب کراچی کے قرآنی احباب کے لئے جزو زندگی بن چکے ہیں خطبات کی ان مجالس کے بانی بھی ڈاکٹر صاحب تھے اور روح رواں بھی وہی۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ میں تو جمعہ کی صبح سے اتوار کی تیاریوں میں مصروف ہو جاتا ہوں۔ اور پھر سوموار کی صبح سے درس کے مضمون کو لوگوں تک پہنچانے میں لگا رہتا ہوں۔ قریب تین سال سے ان کی زندگی اسی نہج پر چل رہی تھی۔

جب گزشتہ ستمبر مجھے سرکاری مکان سے نکلنا پڑا۔ تو یہ چیز ڈاکٹر صاحب پر بڑی شاق گذری۔ ان کی آرزو یہ تھی کہ کسی طرح خطبات کا سلسلہ جلد از جلد میرے اپنے مکان میں شروع ہو جائے۔ چنانچہ رات دن ایک کر کے میرا مکان تیار کرایا گیا

۱۱ر مارچ کی اتوار کی نشست اسی کے صحن میں ہوئی۔ اُس دن ڈاکٹر صاحب کی خوشی کا یہ عالم تھا، گویا ان پر دوبارہ جوانی آرہی ہے وہ آئندہ اتوار کے اجتماع کے لئے خاص ہدایات دے کر رخصت ہوئے۔

۱۴ر مارچ کی شام قریب چھ بجے مجھے اچانک اطلاع ملی کہ ڈاکٹر صاحب کا انتقال ہوگیا۔ معلوم ہوا کہ وہ حسب معمول پانچ بجے اپنے مکان کے صحن میں بیٹھے احباب سے باتیں کر رہے تھے کہ دل میں کچھ گھبراہٹ سی محسوس ہوئی۔ خود ان کا بیٹا (ڈاکٹر) وہیں موجود تھا۔ گھر میں اپنا مطب تھا۔ طبی امداد کا سارا سامان اور دوائیاں سامنے رکھی تھیں۔ لیکن قبل اس کے کہ ان میں سے کسی کے استعمال کی نوبت آتی۔ وہ مسکراتے ہوئے آغوشِ موت سے ہمکنار ہوگئے۔

۱۵ر مارچ (جمعرات) کی صبح میں اپنے ہاتھوں ایک ایسے شفیق بزرگ، مخلص دوست، بلند انسان اور قرآن کے شیدائی کو سپردِ خاک کر آیا، جو اپنے دور کی آخری نشانی تھے۔ مادرِ گیتی اس قسم کے فرزندانِ جلیل روز روز پیدا نہیں کیا کرتی۔

میرے دل کے زخم ابھی مولانا اسلم کی وفات کے صدمہ سے مندمل نہیں ہونے پائے تھے۔ کہ اب میں ایک اور غمگسار بزرگ کی شفقتوں سے محروم ہوگیا۔ جب آلام و مصائب آتے ہیں تو تنہا نہیں آتے۔ ہجوم کرکے آتے ہیں۔ لیکن یہی مواقع ثبات و استقامت کے لئے اپنی پرکھ کے بھی ہوتے ہیں۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

پرویز

مِعراجِ انسانیت

اَز:- پرویز

سیرت صاحب قرآن علیہ التحیۃ والسلام کو قرآن کے آئینہ میں دیکھنے کی پہلی اور کامیاب کوشش۔ مذاہب عالم کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر کے ساتھ ساتھ حضور سرورِ کائنات کی سیرت اور دین کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آگئے ہیں۔ بڑے سائز کے قریباً نو سو صفحات　　قیمت:- بیس روپے

ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام۔ پوسٹ بکس نمبر ۳۱۳، کراچی

تربیتی مرکز

ہفتہ وار طلوعِ اسلام کی آخری اشاعت میں یہ تجویز پیش کی گئی تھی کہ قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کے سلسلہ کو قائم رکھنے اور آگے بڑھانے کے لئے ضروری ہے کہ ایک ایسا تربیتی مرکز کھولا جائے۔ جس میں ہونہار اور صاحبِ ذوق تعلیم یافتہ نوجوانوں کی صحیح تعلیم و تربیت سے انھیں قرآن کا داعی اور پیام رساں بنایا جائے۔ اس تجویز کے سلسلہ میں اب تک متعدد نوجوانوں کے خطوط موصول ہو چکے ہیں۔ لیکن ان میں بیشتر ایسے ہیں۔ جنہوں نے محض جذباتی طور پر اس مقصدِ عظیم کے لئے اپنے آپ کو پیش کر دیا ہے۔ حالانکہ ظاہر ہے کہ اس کے لئے جذباتِ صادقہ کے ساتھ اعلیٰ تعلیم کی شرط لاینفک ہے۔ یہ طالب علم ایسے ہونے چاہئیں جو اتنا کچھ سمجھ سکنے کی صلاحیت رکھتے ہوں کہ عصرِ حاضر میں مختلف علوم کے ائمۂ فکر کس مقام پر کھڑے ہیں۔ اور وحیٔ خداوندی انہیں کونسی راہ نمائی دیتی ہے۔ نیز جو یہ سمجھ سکیں کہ صحیح اسلام کیا تھا۔ وہ کن کن ادوار سے گذرا۔ اور وہ کچھ کیسے بن گیا جسے ہم آج اسلام کہتے ہیں۔ جو زندگی کے تقاضوں اور انسانیت کی منزلِ مقصود سے متعلق افکار و مباحث کا احاطہ کر سکیں۔ اس قسم کی صلاحیت کے لئے ضروری ہے کہ وہ کم از کم علم کے ان شعبوں کے مبادیات سے واقف ہوں اور اپنی فکر و نظر کو قرآنی قالب میں ڈھال لینے کا ولولہ اپنے اندر رکھتے ہوں۔ ان طالب علموں کے ضروری اخراجات کا ذمہ دار ادارہ ہوگا۔

جو طالب علم اس سے پیشتر ہمیں لکھ چکے ہیں۔ ان کے خطوط ہمارے سامنے ہیں۔ ان کے علاوہ جو طالب علم ان خصوصیات کے حامل ہوں۔ اور اس تربیتی مرکز سے فائدہ حاصل کرنا چاہیں، وہ براہ کرم ہمیں اپنے ارادے سے بہت جلد مطلع فرمائیں۔ کیونکہ مرکز کے افتتاح کے فیصلے اور طالب علموں کے انتخاب میں زیادہ تاخیر نہیں کی جا سکتی۔ مرکز میں قیام کی مدت کا اندازہ ایک سال کا لگایا گیا ہے۔　والسلام۔

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام

ایل - ۱۵۹
۳

پی۔ای۔سی۔ایچ۔سوسائٹی۔ کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

وَذَكِّرْهُمْ بِأَيَّامِ اللَّهِ (۱۴/۵)

یوں تو ہر دن خدا ہی کا ہوتا ہے۔ لیکن قوموں کی زندگی میں ایسے دن جب ان کا قدم غیر خدائی قوانین کی محکومی سے قوانین الٰہیہ کی اطاعت کی طرف اٹھے، خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ قرآن نے انہیں ایام اللہ (اللہ کے دن) کہہ کر پکارا ہے۔ یہ مفہوم سورۃ ابراہیم کی ابتدائی آیات سے واضح طور پر سامنے آجاتا ہے۔ جہاں کہا گیا ہے کہ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا أَنْ أَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ۔ ہم نے موسیٰ کو اپنے احکامات دے کر بنی اسرائیل کی طرف بھیجا۔ اور اس سے کہا کہ وہ اپنی قوم کو غیر خدائی غلامی کی تاریکیوں سے نکال کر قوانین خداوندی کی روشنی کی طرف لے جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ "ظلمت سے نور کی طرف لے جانا"، قوم کو فرعون کی محکومیت سے نکال کر سینا کی آزاد فضاؤں کی طرف منتقل کرنا تھا۔ تاکہ وہ وہاں مناسب تعلیم و تربیت کے بعد نظام خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے کے قابل ہو سکیں گے۔ اس کے بعد ہے وَذَكِّرْهُمْ بِأَيَّامِ اللَّهِ انہیں ان وقائع خداوندی (انقلابات الٰہیہ۔ یا ایام اللہ) کی یاد دہانی کراؤ۔ اس لئے کہ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ (۱۴/۵) ان انقلاب آفریں واقعات میں ہر اس قوم کے لئے جو مستقل مزاج ہو۔ اور آزادی کی قدر شناس۔ اپنی زندگی میں اسی قسم کا انقلاب پیدا کرنے کے لئے واضح نشانات راہ ہیں۔

مسلمانانِ پاکستان کی زندگی میں ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کا دن وہی حیثیت رکھتا ہے جو بنی اسرائیل کی قومی زندگی میں اس دن کی حیثیت تھی۔ جب وہ سرزمین مصر کو چھوڑ کر سینا کی وادیوں کی طرف منتقل ہوئے تھے۔ جس طرح بنی اسرائیل کی صورت میں یہ انتقال مکانی اس مقصد کے لئے تھا کہ (۱) انہیں فرعون کی محکومیت سے نکال لیا جائے۔ اور اس کے بعد (۲) انہیں ایسا موقع بہم پہنچا دیا جائے۔ جس سے وہ اپنی زندگی کو اس قالب میں ڈھال سکیں۔ جس میں انسانیت اپنی تکمیل تک پہنچتی ہے۔ اسی کو نظام خداوندی کہا جاتا ہے۔ اسی طرح مسلمانان پاکستان کو تقسیم ہند کی رو سے۔ انگریز اور ہندو کی غلامی سے نکال لیا گیا تھا

تاکہ انھیں ایسا خطۂ زمین میسر آجائے۔ جس میں وہ قوانین الٰہیہ کے تابع آزادانہ زندگی بسر کرنے کے قابل ہوسکیں۔

لیکن قرآن نے یہ بھی کہا ہے کہ بنی اسرائیل کو مصر سے نکلنے کے لئے ان کی طرف خدا کا نبی آیا۔ جس نے آکر بتایا کہ ان کی زندگی کا نصب العین کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس پروگرام میں یہ پہلی کڑی کس قدر اہمیت رکھتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ بنی اسرائیل کا مصر سے نکلنا۔ اور ایک آزاد خطۂ زمین کی طرف منتقل ہونا۔ اس پہلی کڑی کا فطری نتیجہ تھا۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ جب تک کسی قوم کے سامنے "آیات اللہ" نہ آئیں" ایام اللہ" ظہور میں نہیں آسکتے۔ صحیح انقلاب کے لئے صحیح راہ نمائی لاینفک ہے۔ اگر یہ میسر نہ ہو۔ تو قوم کی نقل و حرکت اور سعی و عمل۔ انتشار و فوضویت تو پیدا کرسکتا ہے۔ انقلاب پیدا نہیں کرسکتا۔

مسلمانانِ ہند (پاکستان) کی طرف اس مقصد کے لئے خدا کا کوئی نبی نہیں آسکتا تھا۔ کیونکہ سلسلۂ نبوت، ذاتِ رسالتمآبؐ پر ختم ہوچکا۔ لیکن خدا کی راہ نمائی قرآن کریم کے اندر موجود تھی۔ ضرورت کسی ایسے صاحب نظر کی تھی۔ جو اپنی قرآنی بصیرت سے یہ سمجھ سکے کہ جن حالات میں یہ قوم گھر چکی ہے۔ ان میں ان کے لئے منزلِ مقصود اور کشادگی راہ کونسی ہے۔ اس قوم کی خوش بختی تھی کہ اسے ایک ایسا دیدہ ور میسر آگیا۔ جس نے اپنے مدت العمر کے قرآنی تدبر اور سیاستِ مدن میں مسلمانوں کے خصوصی موقف کے گہرے مطالعہ کے بعد بیسویں صدی کے شروع ہی میں اعلان کردیا کہ مسلمان اپنے دین کی بنا پر ایک جداگانہ قوم بنتا ہے۔ اپنے

بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

جو مسلمان قرآنی تعلیم سے بے خبری کی بنا پر مغربی سیاست کی تقلید میں اشتراکِ وطن کو مدارِ قومیت قرار دیتے تھے۔ انھیں اس دیدہ ور نے بار بار بتایا کہ مغرب نے خدائے رب العالمین کو چھوڑ کر اپنی پرستش کے لئے نئے نئے 'خدا' تراشے ہیں۔ اور

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے   جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

اس آواز کی اپنوں اور بیگانوں سب کی طرف سے مخالفت ہوئی۔ بیگانوں کی طرف سے اس لئے کہ وہ اس آواز سے اپنی اکثریت کی بنا پر غلبہ و تسلط کا خواب پریشاں ہوتا دیکھتے تھے۔ اور اپنوں میں سے اکثر دین کی حقیقت سے ناواقفیت کی بنا پر اور بعض ذاتی اغراض و مصالح کے پیش نظر اس کے مخالف تھے۔ لیکن وہ حکیم الامتؒ ان مخالفتوں کی پرواکئے بغیر اپنے اس پیغام کو دہراتا رہا۔ اور دور دور تک پہنچاتا چلا گیا۔ حتیٰ کہ اس نے دسمبر ۱۹۳۰ء میں الٰہ آباد کے مقام پر قوم سے کھلے کھلے الفاظ میں کہہ دیا کہ مسلمان قرآنی تصور کے مطابق اسی صورت میں اسلامی زندگی بسر کرسکتے ہیں۔ جب ان کی اپنی آزاد مملکت ہو۔ جہاں وہ قوانین خداوندی کو نافذ کرسکیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہندوستان کے جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ ان میں مسلمانوں کی اپنی مملکت قائم ہو۔

یہ تھا قرآن کی رُو سے وہ نصب العین جو حکیم الامت علامہ اقبال نے قوم کے سامنے رکھا۔ صدیوں سے غلامی کی خوگر قوم نے اسے ایک شاعر کا حسین خواب اور ایک فلسفی کا ناقابلِ عمل تصور کہہ کر استہزاء و استخفاف کی ہنسی سے ٹھکرا دیا۔ بڑے بڑے "مقدسین" نے اسے "اسلام کے خلاف" قرار دیکر خدا اور رسول کے نام پر اس کی مخالفت شروع کردی۔ بعض ایسے بھی تھے۔ جنھوں نے مسلمانوں

کی جداگانہ قومیت کے اصول کی حد تک تو ساتھ دیا۔ لیکن مسلمانوں کی ایک آزاد مملکت کے تصور کی سخت مخالفت کی اور اسے "زہر ہلاہل" بتا کر قوم کو اس سے دور رہنے کی تلقین کی۔ لیکن وہ دانائے راز کہ قرآنی بصیرت نے جس کی نگاہوں کے سامنے حقائق کو بے نقاب کر دیا تھا۔ نہ سیاسی غوغا آرائیوں سے گھبرایا۔ اور نہ ہی ان مقدسین کے طعن و تشنیع سے پریشان ہوا۔ اس نے سنہ ۱۹۳۰ء میں کہہ دیا تھا کہ میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ ایسا ہونا مسلمانوں کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے۔ اگر انہوں نے اس کے لئے پوری جدوجہد کی تو اس نصب العین تک جلدی پہنچ جائیں گے۔ اگر انھوں نے تساہل برتا تو اس کی تشکیل میں دیر لگ جائے گی۔ لیکن ایسا ہو کر رہے گا ضرور۔ ہندی سیاست میں اس کے بعد ایسے تغیرات واقع ہوئے تھے جس کے پیش نظر ایسا دکھائی دیتا تھا کہ اس نصب العین کا حصول ممکن نہیں ہوگا۔ لیکن حضرت علامہ کو اپنی بصیرت پر اس قدر اعتماد تھا کہ حالات کی ناسازگاری ان کے یقین کو محکم سے محکم تر کئے جاتی تھی۔ چنانچہ وہ اپنی زندگی کے آخری سانس تک اس پیغام کو دہراتے اور افرادِ کارواں کے دل میں شمع یقین کو روشن سے روشن تر کرتے چلے گئے۔ کون نہیں جانتا کہ جب مارچ سنہ ۱۹۳۸ء میں حسین احمد صاحب مدنی نے یہ اعلان کیا کہ "قومیتیں اوطان سے بنتی ہیں" تو باوجودیکہ آپ اس وقت مرض الموت میں مبتلا تھے۔ آپ نے اپنے اس بیان میں جو ہماری تاریخ میں روشنی کے مینار کی سی حیثیت رکھتا ہے۔ اس اہم سوال کو اس فہم و بصیرت، جزم و یقین کے ساتھ حل کیا۔ جس نے کئی متذبذبین کے دلوں میں از سرِ نو استقامت پیدا کر دی۔

آپ نے غور کیا کہ اس مردِ مومن نے اسوۂ انبیاء کرام کی اتباع میں قوم کو اس نصب العین سے کس طرح روشناس کرایا۔ جو ان میں اتنے بڑے خارجی انقلاب کا موجب بنا؟ یہ انقلاب یعنی مسلمانانِ ہند کی انگریز اور ہندو کی محکومیت سے آزادی اور ان کا ایک آزاد خطۂ زمین کی طرف انتقال، علامہ اقبال کی وفات کے بعد ظہور میں آیا۔ لیکن یہ محض وقت کا سوال تھا۔ اس کا بیج سنہ ۱۹۳۰ء میں ڈالا جا چکا تھا بلکہ سنہ ۱۹۰۸ء میں جب انھوں نے کہا تھا کہ بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے۔

لیکن سنہ ۱۹۴۷ء میں جو کچھ ہوا۔ وہ فقط اتنا تھا کہ مسلمانوں کو ایک خطۂ زمین مل گیا۔ جس میں انھیں یہ امکانی قوت حاصل ہو گئی کہ وہ اپنی ہیئت اجتماعیہ کو اس قالب میں ڈھال سکیں جو اللہ تعالیٰ نے تکمیلِ شرفِ انسانیت کے لئے متعین کیا ہے۔ اسی طرح جیسے بنی اسرائیل کا مصر سے وادیٔ سینا کی طرف آنا۔ اس بلند مقصد کے حصول کی اولین منزل تھا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ بنی اسرائیل کے واقعہ اور مسلمانانِ پاکستان کے اس انقلاب کی کڑیاں ایک دوسرے کے ساتھ متوازی چلی جاتی ہیں۔ بنی اسرائیل مصر سے آئے تو بدقسمتی سے ان کے ساتھ سامری بھی آگیا۔ جس کے آنے کا مقصد ہی یہ تھا کہ ایک مقدس، ناصح، مشفق کے لباس میں اس قوم کو صحیح راستے سے بہکاتا رہے۔ بعینہٖ اسی طرح جب ہندوستان کے مسلمان پاکستان کی طرف آئے۔ تو ان کے ساتھ بھی سامری آ گئے۔ ان سامریوں کا شیوہ یہ ہے کہ یہ قوم سے زیورات مانگ کر لیتے ہیں۔ اور انہیں گوسالے بنا بنا کر پرستش کے لئے دیئے جا رہے ہیں۔ قوم بنی اسرائیل، آلِ فرعون کے فریب سے بچ نکلی تھی۔ اس لئے کہ وہ کھلے بندوں سامنے آتے اور خدا کے پیغام اور نظام کی مخالفت کرتے تھے۔ لیکن ان کے لئے سامری کے فریب سے بچ جانا مشکل تھا۔ اس لئے کہ وہ حضرت موسیٰ سے

کے متبع کی حیثیت سے ساتھ آیا تھا۔ اس کا رنگ اس کے اپنے الفاظ میں یہ تھا کہ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ۔ میں نے رسول کے نقشِ قدم سے کچھ حصہ پا لیا تھا۔ اور اسی نقاب میں بنی اسرائیل کے ساتھ آیا تھا فَنَبَذْتُهَا وَكَذٰلِكَ سَوَّلَتْ لِيْ نَفْسِيْ میرے نفس کی مفاد پرستیوں نے ایک اور خوشنما نقشہ میرے سامنے پیش کر دیا۔ اس کے لئے میں نے رسول کی تعلیم کو اٹھا الگ کیا۔ اور بنی اسرائیل کو گوسالہ کی پرستش میں لگا لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ قومیں ان لوگوں کی مخالفت سے اتنی تباہ نہیں ہوتیں۔ جو کھلے بندوں ان کے مقابلہ میں آتے ہیں۔ جتنی کہ وہ ان کے حربوں سے برباد ہوتی ہیں جو قبضۃ من اثر الرسول کے مقدس نقابوں میں سامنے آتے ہیں۔ مودودی صاحب کے الفاظ میں (جو انہوں نے اسلام اور جاہلیت کے تصادم کے سلسلہ میں لکھے تھے)

> کھلے دہریے یا مشرکین و کفار سامنے ہوتے تو مقابلہ شاید آسان ہوتا۔ مگر وہاں تو آگے آگے توحید کا اقرار، صوم و صلوٰۃ پر عمل، قرآن و حدیث سے استشہاد تھا۔ اور اس کے پیچھے جاہلیت اپنا کام کر رہی تھی۔ ایک ہی وجود میں اسلام اور جاہلیت کا اجتماع ایسی سخت پیچیدگی پیدا کر دیتا ہے کہ اس سے عہدہ برآ ہونا ہمیشہ جاہلیت صریحہ کے مقابلہ کی بہ نسبت ہزاروں گنا زیادہ مشکل ثابت ہوا ہے۔ عریاں جاہلیت سے لڑیئے تو لاکھوں مجاہدین سر ہتھیلیوں پر لئے آپ کے ساتھ ہو جائیں گے۔ اور کوئی مسلمان علانیہ اس کی حمایت نہیں کر سکے گا۔ مگر اس مرکب جاہلیت سے لڑنے جایئے۔ تو منافقین ہی نہیں۔ بہت سے اصلی مسلمان بھی اس کی حمایت پر کمربستہ ہو جائیں گے۔ اور الٹا آپ کو موردِ الزام بنا ڈالیں گے۔
>
> (منصب تجدید کی حقیقت)

مسلمانانِ پاکستان کے ساتھ یہی ہوا۔ وہ ہندو اور انگریز (جنہے کہ متحدہ قومیت کے مؤید نیشنلسٹ علماء تک) کے مقابلہ میں تو کامیاب ہو گئے (کیونکہ وہ کھلے بندوں میدان میں آ گئے تھے) لیکن ان سامریوں کے دامِ تزویر کے حریف نہ ہو سکے جنہوں نے خود اقبالؒ سے جداگانہ قومیت کا تصور لے کر (قبضۃ من اثر الرسول کی طرح) مسلمانوں میں مقبولیت حاصل کر لی تھی۔ لیکن جو ان کے ساتھ آئے اس لئے تھے کہ یہاں اس قرآنی نظام کے بجائے جسے نبی اکرمؐ نے قائم فرمایا تھا، اور جس کے قیام کے لئے اقبالؒ اس خطۂ زمین کے حصول کا آرزومند تھا۔ وہ خود ساختہ نظام قائم کر دیا جائے۔ جس میں پیشوائیت کے مفاد کا تحفظ ہو۔ اور انہیں غلبۂ اقتدار حاصل ہو جائے۔ بنی اسرائیل تو سحر سامری سے اس طرح بچ گئے کہ ان میں حضرت موسیٰ موجود تھے۔ لیکن ہمارے سامری اس وقت میدان میں آئے۔ جب ہماری بدقسمتی سے علامہ ہم میں موجود نہ تھے۔ اگر وہ زندہ ہوتے۔ تو یہ میدان میں آنے کی جرأت ہی نہ کرتے۔ جس اقبالؒ کے تین شعر حسین احمد مدنی جیسی شخصیت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر گئے۔ یہ سامری ان کے ضربِ کلیمی کے حریف کس طرح ہو سکتے تھے۔ لیکن اس میں بھی

ــــــــــــ

ل حاشیہ صفحہ پر دیکھئے)

مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ اقبالؒ نے جس قرآن کا پیغام قوم تک پہنچایا تھا۔ وہ قرآن ہمارے پاس اپنی زندہ و تابندہ صورت میں موجود ہے۔ پس ضرورت اس کی ہے کہ جس طرح حضرت علامہ اس نصب العین کے متعلق قرآن کے پیغام کو مسلسل و پیہم پورے جزم و یقین اور جرأت و بے باکی کے ساتھ پیش کرتے رہے۔ اسی یقین و استقامت کے ساتھ قرآن کی آواز قوم تک پہنچائی جاتی رہے۔ طلوع اسلام جو حضرت علامہؒ کی یادگار میں جاری ہوا ہے۔ ان کے اس مشن کی تکمیل میں امکان بھر کوشش کئے جا رہا ہے اور زندگی بھر کئے جائے گا۔ اسے یقین ہے کہ جس طرح ہزار مخالفتوں کے باوجود پاکستان کا خطۂ زمین مسلمانوں کو مل کر رہا۔ اسی طرح اس خطۂ زمین میں سامریوں کی لاکھ گوسالہ سازیوں کے علی الرغم خدا کا متعین فرمودہ نظام قائم ہو کر رہے گا۔ اگر قوم نے اس کے لئے کوشش کی تو یہ جلدی وجود پذیر ہو جائے گا۔ اگر اس میں تساہل برتا تو دیر میں قائم ہوگا۔ لیکن قائم ہوگا ضرور۔ اقبالؒ کے دیدۂ تر کی بے خوابیاں۔ اور اس کے دل پر درد کی بیتابیاں۔ اس کے نالۂ نیم شب کا نیاز اور اس کی خلوت و انجمن کا گداز اس کی امنگیں اور آرزوئیں اور امیدیں اور جستجوئیں کبھی رائیگاں نہیں جا سکتیں۔ اس وقت تو یہ عالم ہے کہ قوم اقبالؒ ہی کو فراموش کئے جا رہی ہے (اور کچھ منظم کوششوں سے کرایا جا رہا ہے) حتیٰ کہ حکومت پاکستان، جسے یہ سب کچھ اقبالؒ ہی کے دیئے ہوئے تصور سے ملا ہے۔ اقبالؒ کے یوم وفات (۲۱ اپریل) تک کو مملکت کی قابل یاد تقاریب میں شامل کرنے کے لئے تیار نہیں۔ (وائے احسان ناشناسی اور قدر فراموشی!) لیکن جس کا ثبات جریدۂ عالم پر ثبت ہو چکا ہو۔ اس کی یاد کون سی قوت مٹا سکتی ہے؟ اقبالؒ کا جلایا ہوا دیا پھونکوں سے نہیں بجھایا جا سکتا۔ اسے اس نے تیل کے بجائے خون جگر کے قطرات سے فروزاں کیا۔ اور اپنے سینے کے فانوس میں جگہ دے کر زمانے کے جھکڑوں سے محفوظ رکھا۔ یہ دیا جلتا رہے گا۔ اور روشن سے روشن تر ہوتا جائے گا۔ خواہ خفاشان ازلی کو اس کی روشنی کتنی ہی ناگوار کیوں نہ گذرے۔ اس لئے کہ یہ اکتساب ضیا کرتا ہے اس چشمۂ نور سے جسے خود خدا نے کتاب مبین اور سراجاً منیرا کہا ہے۔ اقبالؒ کی صحیح یادگار قرآن کے پیغام کو دنیا تک پہنچانا ہے … اور پاکستان میں قرآنی نظام کو قائم کرنا ہے۔ اور اسی میں سامریوں کی شکست ہے۔

اقبالؒ کا نام لینے والو! آؤ اور اقبالؒ کی صحیح یادگار اس طرح قائم کرو۔

(اگلے پرچہ میں) **دستور پاکستان** (اس کی کون کون سی شقیں قرآن کی رو سے قابل ترمیم ہیں)

(حاشیہ گذشتہ صفحہ)

عجم ہنوز نداند رموز دیں ورنہ
ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است

سرود بر سر منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر ز مقام محمد عربی است

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

۲۳ مارچ

مملکتِ پاکستان کا پہلا آئین منظور ہو گیا۔ لیکن حکومت پاکستان نے فیصلہ کیا ہے کہ اس آئین کا نفاذ ۲۳ مارچ سے کیا جائے یہ سوال قریب قریب ہر ایک کی زبان پر ہے کہ مارچ کی تئیس تاریخ کو کیا خصوصیت حاصل ہے جس کی وجہ سے اسے یوم آئین قرار دیا گیا ہے۔ ہم میں سے جو لوگ گزشتہ بیس پچیس سال سے مسلمانانِ ہند و پاکستان کی سیاست سے باخبر رہے ہیں انھیں تو یہ معلوم ہو گا کہ ہماری ملی تاریخ میں ۲۳ مارچ کو کیا خصوصیت حاصل ہے۔ لیکن ہماری ابھرنے والی نسل کے بچوں کے لئے یہ سوال واقعی ایک چیستاں ہے۔ ضرورت ہے کہ اس تاریخ کی خصوصیت سے انھیں آشنا کرایا جائے۔ اور مسلمانانِ ہند و پاکستان کی تاریخ میں اسے اہم مقام دیا جائے۔ اس تاریخ (۲۳ مارچ) کا تعلق سنہ ۱۹۴۰ء سے ہے لیکن سنہ ۱۹۴۰ء تک پہنچنے سے پہلے دسمبر سنہ ۱۹۳۰ء کا تذکرہ ضروری ہے جب ہمارے کاروانِ ملت نے شاہراہِ زندگی پر ایک نیا موڑ مڑا تھا۔ بجائے اس کے کہ ہم اپنی تاریخ کے ان اہم سنگہائے میل کا تعارف جدید الفاظ میں کرائیں۔ یہ زیادہ مناسب ہو گا کہ طلوع اسلام نے جن الفاظ میں ان کا سب سے پہلی مرتبہ تذکرہ کیا تھا۔ انھیں الفاظ کو یہاں دہرا دیا جائے۔ اس سے جہاں ان اہم دقائع کی اہمیت سامنے آجائے گی وہاں یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ طلوع اسلام کس طرح کاروانِ ملت کا ہم رکاب رہا ہے۔

مارچ سنہ ۱۹۴۰ء کے طلوع اسلام میں "صبح امید" کے عنوان سے حسب ذیل شذرہ شائع ہوا تھا۔

صبح امید

کھول کر آنکھیں مرے آئینۂ گفتار میں
آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ　　(اقبالؒ)

سنہ ۱۹۳۰ء کا ذکر ہے مسلمانوں نے ایک مدت کی گہری نیند کے بعد کروٹ لی تھی۔ ایک عرصہ کے منجمد خون میں کچھ کچھ روانی کے آثار محسوس ہو رہے تھے۔ ایک زمانے کے جمود و تعطل کی برف کی سلیں حوادثِ زمانہ کی تمازت سے ذرا پگھلنی شروع ہوئی تھیں۔ ایک دشت نا پیدا کنار میں کھوئے ہوئے قافلہ کے افراد میں اپنی متاعِ گم گشتہ کا کچھ نہ کچھ احساسِ زیاں پیدا ہو رہا تھا۔ لیکن فکر و نظر کی پریشانیوں کے باعث کوئی زندہ و پائندہ راہِ عمل نظر نہیں آتی تھی۔ پاؤں آمادۂ سفر تھے۔ لیکن نہ منزل کا کوئی پتہ تھا۔ نہ نشانِ

راہ ہی دکھائی دیتا تھا۔ عوام تو ایک طرف، کشتیٔ ملت کے پختہ کار ناخدا بھی عام طور پر مخلوط و جداگانہ انتخاب، اور تخصیص نشست و نیابت کے سود و زیاں کے پیچ در پیچ مسائل میں الجھ رہے تھے۔ ان کے مطالبات، مذہبی اور ثقافتی تحفظات کی حدود میں گھر کر رہ چکے تھے۔ اور ان کی نگاہیں جمہوری نظام حکومت کی بظاہر درخشندہ افق پر جا کر رک چکی تھیں۔ بالعموم یہ وہ حضرات تھے جنہیں فطرت نے صرف "دانش برہانی" عطا فرمائی تھی۔ وہ دانش جو محض احوال و ظروف کے امیال و عواطف اور عواقب و واقعات کے تجارب و مشاہدات سے استنباط نتائج کے بعد ہی کسی فیصلہ پر پہونچا سکتی ہے۔ اس سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ لیکن اس محشرستان انتشار و تشتت میں اللہ کا ایک بندہ ایسا بھی موجود تھا۔ جسے مبداء فیض کی کرم گستری نے دانش برہانی کے ساتھ "دانش نورانی" کی متاع گراں بہا سے بھی سرفراز فرمایا تھا۔ یعنی وہ دانش جو قرآن کریم کے حقائق و معارف پر تدبر و تفکر سے ایک مرد مومن کی نگاہوں میں وہ بصیرت پیدا کر دیتی ہے جس سے وہ ان نفسیاتی کیفیات کا مشاہدہ کر لیتا ہے۔ جن سے اقوام و ملل کے مقدرات کے سانچے بنتے اور بگڑتے ہیں۔ اور ان مشاہدات سے اس کے آئینۂ ادراک میں آنے والے دور کی ایک دھندلی سی تصویر نظر آ جاتی ہے۔ اس کی نگہ دوررس آشیانہ[1] کی نظر فریب پائداری کے بجائے اس شاخ کی نمو پر ہوتی ہے۔ جس پر وہ آشیانہ استوار ہوتا ہے۔ اس لئے وہ عام لوگوں کی طرح کبھی خوش آئند الفاظ کے سحر سے مسحور اور بلند آہنگ دعاوی کے شور سے مرعوب نہیں ہوتا۔ اس کی نگاہ حقائق پر ہوتی ہے۔ اور وہ انہی حقائق کی دوربین سے پردۂ افلاک کے پیچھے چھپے ہوئے حوادث کا نظارہ کرتا ہے:

ہاں! تو اس ہنگامہ زار انتشار و خلفشار میں یہ مرد مومن جسے قسام ازلی نے اس قسم کی روشن بصیرت سے نوازا تھا اٹھا۔ قافلے کے چند بکھرے ہوئے افراد کو یکجا جمع کیا اور کہا کہ آؤ! میں تمہیں بتاؤں کہ قرآن کریم نے تمہاری منزل کون سی متعین کر رکھی ہے۔ اور ہندوستان کے احوال و ظروف کے پیش نظر اس منزل تک پہنچنے کے لئے کون سی صراط مستقیم ہے اس نے گرد و پیش کے حالات کا تجزیہ کیا۔ اور اس کے بعد کہا کہ:۔

> "اس سے ظاہر ہو گیا کہ ہندوستان جیسے ملک میں ایک ہم آہنگ 'کل' کی تشکیل کے لئے بلند سطح کی فرقہ پرستی بالکل ضروری اور ناگزیر ہے۔ برعکس یورپین ممالک کے، ہندوستان میں جماعتی تشکیل کی بنا جغرافیائی حدود نہیں۔ ہندوستان ایک ایسا بر اعظم ہے جس میں مختلف النسل، مختلف اللسان، مختلف المذاہب انسانوں کی جماعتیں آباد ہیں۔ ان کے نظریۂ زندگی کی بنا کسی مشترک نسلی شعور پر نہیں ہے حتیٰ کہ ہندو بھی کوئی ایسی جماعت نہیں ہے۔ جس کے مختلف افراد میں فکر و نظر کی یکسانیت ہو۔ ہندوستان میں یورپین اصولوں کے مطابق جمہوریت کی تشکیل

---

[1] تمہاری تہذیب اپنے ہاتھوں سے آپ ہی خودکشی کرے گی — جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہو گا (اقبالؒ)

> نہیں ہو سکتی۔ جب تک یہاں مختلف فرقوں کی جداگانہ ہستی کو تسلیم نہ کر لیا جائے۔ لہٰذا مسلمانوں کا یہ مطالبہ بالکل حق بجانب ہے کہ ہندوستان کے اندر ایک اسلامی ہند (MUSLIM INDIA) کو معرض وجود میں لایا جائے۔ ...... میری آرزو یہ ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد ریاست قائم کی جائے۔ ہندوستان کو حکومت خود اختیاری زیر سایہ برطانیہ ملے یا اس سے باہر کچھ بھی ہو۔ مجھے تو یہی نظر آتا ہے کہ شمال مغربی ہندوستان میں ایک متحدہ اسلامی ریاست کا قیام کم از کم اس علاقہ کے مسلمانوں کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے ...... ہندوستان دنیا بھر میں سب سے بڑا اسلامی ملک ہے۔ اس ملک میں اسلام بحیثیت ایک تمدنی قوت کے اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے کہ اسے ایک مخصوص علاقہ میں مرکوز کر دیا جائے۔ مسلمانان ہند کے اس زندہ اور جاندار طبقہ میں کہ جس کے بل بوتے پر یہاں برطانوی راج قائم ہے (باوجودیکہ برطانیہ نے ان سے کبھی منصفانہ سلوک نہیں کیا) اگر یوں ایک مرکزیت قائم کر دی جائے۔ تو یہ آخر الامر نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام ایشیا کی گتھیاں سلجھا دے گا ...... یہ مطالبہ مسلمانوں کی اس دلی خواہش پر مبنی ہے کہ انہیں بھی کہیں اپنے نشو و ارتقاء کا موقعہ ملے۔ اس لئے کہ اس قسم کے مواقع کا حاصل ہونا اس وحدت قومی کے نظام حکومت میں قریب قریب ناممکن ہے۔ جس کا نقشہ ہندو ارباب سیاست اپنے ذہن میں لئے بیٹھے ہیں۔ اور جس سے مقصد وحید یہ ہے کہ تمام ملک میں مستقل طور پر انہیں غلبہ اور تسلط ہو۔"
>
> (خطبۂ صدارت حضرت علامہ اقبالؒ علیہ الرحمۃ بتقریب سالانہ اجلاس مسلم لیگ الٰہ آباد منعقدہ ۱۹۳۰ء)

یہ ایک نئی آواز تھی جو ہندوستان کی فضا میں غلغلہ انداز ہوئی۔ یہ ایک انوکھا نصب العین تھا جو ہندی مسلمانوں کے لئے رکھا گیا۔ نیا اور انوکھا اس لئے کہ مسلمان صدیوں کی غلامی سے یہ بھول ہی چکا تھا کہ قرآن کریم کی رو سے ایمان و اعمال صالحہ کا فطری نتیجہ استخلاف فی الارض ہے۔ اور مسلمان دنیا میں صرف اس لئے زندہ ہے کہ وہ خدا کی اس وسیع و عریض زمین پر حکومت خداوندی قائم کرے۔ چونکہ یہ آواز کانوں کو بالکل نامانوس معلوم ہوئی۔ اس لئے کسی نے اسے درخور اعتناء نہ سمجھا۔ کسی نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ یہ ایک شاعر کے عالم تصور کے حسین خواب ہیں۔ کوئی یہ سمجھ کر ہنس دیا کہ یہ ایک فلسفی کے طرفہ زاد دماغ کی اپج ہے جو ہندوستان کو ایک ملک نہیں بلکہ مجموعۂ ممالک قرار دیتا ہے۔ جو یہاں کے باشندوں کو ایک قوم نہیں بلکہ مختلف اقوام کا مجموعہ خیال کرتا ہے۔ جو مسلمانوں کو ایک اقلیت نہیں۔ بلکہ مستقل بالذات جداگانہ قوم گردانتا ہے جو اس بیسویں صدی میں جمہوری نظام حکومت کو ہندوستان کے لئے ناقابل عمل ٹھہراتا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جو ہندوستان

کے دو ٹکڑے کرکے ہندوؤں اور مسلمانوں میں مستقل طور پر حدِّ فاصل قائم کرنا چاہتا ہے۔

اس نے یہ سب کچھ سنا اور ایک خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ خاموش ہو گیا۔

وقت گزرتا گیا۔ حالات بدلتے گئے۔ اور ابھی دس برس بھی گزرنے نہ پائے تھے کہ واقعات نے یہ تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا کہ سیاست ہند کی گتھیوں کا حل سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ جو ۱۹۳۰ء میں اس دیدۂ بینائے قوم نے پیش کیا تھا (رحمہ اللہ تعالیٰ) آج یہ مسائل ایک ایک کرکے واضح اور مبین طور پر سامنے آ چکے ہیں کہ ہندوستان ایک ملک نہیں بلکہ مجموعۂ ممالک ہے مسلمان ایک فرقہ نہیں بلکہ جداگانہ قوم ہیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی سیاسی کشمکش کا تصفیہ فرقہ وارانہ انداز پر نہیں بلکہ بین الاقوامی حیثیت سے ہو سکتا ہے۔ بنا بریں مغربی انداز کا نظام جمہوریت یہاں قابل عمل نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا ان امراض کا واحد علاج تقسیم ملک ہے۔ آج اس کے لئے گوشہ گوشہ سے آوازیں بلند ہو رہی ہیں مختلف اسکیمیں اور تجاویز پیش ہو رہی ہیں۔ ہر شخص اسی نہج پر سوچتا۔ اور اسی طریق عمل کو جادۂ مستقیم سمجھتا ہے۔ حتیٰ کہ خود ہندوؤں کا وہ طبقہ جو اپنے آپ کو فریب میں مبتلا نہیں رکھنا چاہتا۔ وہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ ہندی مسائلِ سیاست کا حل اس کے سوائے کچھ اور نہیں مثلاً این۔ سی دت (سابق رکن آل انڈیا کانگرس کمیٹی) اپنے ایک مراسلہ میں لکھتے ہیں۔

> "ان حالات میں میرا خیال ہے کہ ہندو مسلم تصفیہ کا حل یہی ہوگا کہ ہندوستان میں ہندو اور مسلمانوں کو دو قومیں سمجھ لیا جائے۔ اور پھر دو قوموں کی حیثیت سے ان کے ساتھ ایک متحدہ قومیت کا خیال ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دل سے نکال دیا جائے۔ مسٹر جناح نے حال ہی میں گاندھی جی کو جواب دیتے ہوئے متحدہ قومیت کے تصور کو سراب کے لفظ سے تعبیر کرکے جس خیال کا اظہار کیا ہے۔ وہ میرے خیال میں اب نہیں تو کل حقیقت ہو کر رہے گا۔ بہرحال اگر یہ چیز بھی جلد طے ہو جائے تو کچھ برا نہیں۔ یوگوسلاویہ کے کروٹ اور سرب کی طرح اگر ہندوستان کے ہندو اور مسلمانوں میں بحیثیت۔ فرقے کے نہیں بلکہ بحیثیت دو قوموں کے سمجھوتہ ہو جائے اور مسلم اکثریت کے علاقوں میں ہندو اکثریت کے علاقے مداخلت نہ کریں اور ہندو اکثریت کے صوبوں میں مسلمان مداخلت نہ کریں۔ تب بھی ہندوستان کا اجتماعی مفاد محفوظ رہ سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب ہمیں پاکستان کے خیال سے ڈرنا نہ چاہیئے۔ البتہ اس میں مناسب ترمیم و اصلاح کرکے اسے اپنے حسب حال بنانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔" (مدینہ یکم فروری ۱۹۴۴ء)

اس میں شبہ نہیں کہ حوادث زمانہ کا ستایا ہوا مسلمان ضعف عزیمت و شدت انتشار کی وجہ سے ہنوز اپنے بازوؤں میں وہ قوت محسوس نہیں کرتا۔ جو ان چٹانوں کو ریت کے ذرّوں میں تبدیل کر دے۔ جو اس کی منزل کے راستے میں حائل ہیں لیکن جب اس نے اپنا نصب العین متعین کر لیا ہے۔ اور اس کے دل میں اپنے نصب العین تک پہنچنے کا عزم راسخ ہو چکا ہے

تو ان عارضی حوادث و موانع سے گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ آپ اسی نہج پر قدم اٹھاتے چلئے۔ چند دنوں کے بعد آپ دیکھ لیں گے کہ توفیق ایزدی (اسی مرد راہ یں علیہ الرحمۃ کے الفاظ میں)

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش　　اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائیگی
اس قدر ہوگی ترنم آفریں باد بہار　　نکہتِ خوابیدہ غنچے کی نوا ہو جائیگی
آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک　　بزم گل کی ہم نفس باد صبا ہو جائیگی
پھر دلوں کو یاد آجائے گا پیغام سجود　　پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائیگی
نالۂ صیاد سے ہوں گے نوا ساماں طیور　　خونِ گلچیں سے کلی رنگیں قبا ہو جائیگی

شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے　　(اقبال ۱۹۱۲ء)

مارچ ۱۹۴۰ء میں لاہور میں آل انڈیا مسلم لیگ کا وہ سالانہ اجلاس منعقد ہوا جس نے علامہ اقبالؒ کے اس حسین و جمیل خواب کو عزمِ عملی کی شکل　عطا کردی۔ اس تقریب پر طلوع اسلام نے قائد اعظم کی خدمت میں جو سپاسنامہ پیش کیا، وہ بھی ایک تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ لہٰذا اس کا درج کیا جانا بھی فائدہ سے خالی نہیں ہوگا۔ دھو ھذا۔

بہ شرف نظر

شیر بیشۂ بیباکی و حریت۔ ضیغم نیستان جرات و بسالت۔ شاہین افلاک تدبر و سیاست۔ پروانۂ شمع اخوت و حمیت۔ طرۂ کلاہِ ملک و ملت۔ بطل جلیل ہندیاں۔ قائد اعظم اسلامیان۔ عزت مآب محترم المقام جناب محمد علی جناح مدظلہ العالی۔

بہ تقریب سالانہ اجلاس آل انڈیا مسلم لیگ۔ بمقام لاہور

حریت نواز!

ذرا تصور میں لایئے ایسے وقت کو کہ ایک وحشت انگیز ہولناک بیابان میں راہ گم کردہ مسافروں کا ایک بکھرا ہوا قافلہ نشانِ منزل سے مایوس ہو کر ضعفِ عزیمت سے پاشکستہ بیٹھ چکا ہو۔ ایک درماندہ راہرو کی صدائے دردناک جو آوازِ رحیل کا کام دے رہی تھی، فطرت کے اٹل قوانین کے ماتحت خاموش ہو چکی ہو۔ شام کا بھیانک سناٹا سر پر منڈلانے والی شب تیرہ و تار کی ہیبت انگیزیوں کا پیام جانکاہ دے رہا ہو۔ غاروں میں چھپے ہوئے درندوں کے پاؤں کی آہٹ موت کو قریب تر لاتی نظر آرہی ہو۔ درختوں کی اوٹ میں بیٹھے ہوئے رہزنوں کی ریشہ دوانیاں، دامن

صحرا پر پھیلتے ہوئے اندھیرے کے ساتھ بڑھتی چلی آ رہی ہوں۔ وہ لوگ جن کی قیادت و سیادت پر بھروسہ تھا۔ برادرانِ یوسف کی طرح اپنے قافلہ کی گراں بہا متاع دوسروں کے ہاتھ بیچ ڈالنے کی فکر میں ہوں۔ غرضیکہ ہلاکت یقینی اور تباہی اٹل معلوم ہوتی ہو۔ افرادِ قافلہ میں سے جن کے دلوں میں اس الم انگیز کیفیت کا احساس ہو۔ ان کی نگاہیں رہ رہ کر آسمان کی طرف اٹھ رہی ہوں کہ دُور۔ افقِ امید سے ایک شاہسوار رواں دواں۔ امیدوں کی ایک دنیا اپنے ساتھ لئے ان سوختہ سامانوں کی طرف بڑھتا چلا آئے۔ منتشر افرادِ کارواں کو پھر سے ایک مرکز پر جمع ہونے کی دعوت دے اور اپنوں اور بیگانوں کی تیار کردہ ہلاکت و بربادی کی گھاٹیوں سے بچاتا ہوا انھیں کسی محفوظ مقام کی طرف لے جانے کی فکر کرے۔ اندازہ فرمایئے کہ جو قلبی کیفیت اُس وقت ان راہ گم کردہ مسافروں کی ہوگی۔ وہی حالت آج ملتِ اسلامیہ (ہندیہ) کی ہے۔ تحریکِ آزادی کے آغاز میں مسلمانوں کی عمومی حالت یہ تھی کہ یہ ریت کے ذروں کی طرح بکھرے پڑے تھے کہ تیز ہوا کا جھونکا آتا اور انھیں ادھر سے ادھر اڑا لے جاتا، پانی کی رو آتی اور انھیں اپنے ساتھ لے جاتی۔ اس کاروانِ بے سالار کی متاعِ گراں بہا کو لوٹنے کے لئے چاروں طرف سے قومیں ہجوم کرکے آ رہی تھیں۔ غیر تو غیر خود اپنوں کی یہ حالت تھی کہ ان کی سحر طرازیاں اور فسوں سازیاں۔ ملتِ بیضا کو خدائے طورِ سینا سے ہٹا کر گوسالہ پرستی کی دعوت دیتی تھیں۔ غرضیکہ حالت یہ تھی کہ

نشانِ راہ دکھاتے تھے جو ستاروں کو　　ترس گئے تھے کسی مردِ راہ داں کے لئے[1]

قوم کی صحیح راہنمائی کرنے والے ایک ایک کرکے چل بسے تھے۔ بزمِ ملت کی آخری شمع جس کی ضیا پاشیوں سے لاکھوں آنکھیں پرنور تھیں۔ ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کی صبح کو بجھ چکی تھی[1]۔ اس کس مپرسی اور بیکسی کے عالم میں اللہ تعالیٰ نے اس منتشر قافلہ کی شیرازہ بندی کے لئے آپ کی ذاتِ گرامی کو چن لیا۔ اور آپ کی نگہِ دور رس نے اس قافلے کو بتایا کہ ان کے گرد و پیش کس کس قسم کی خطرناک گھاٹیاں موجود ہیں۔ وہ گھاٹیاں کہ جن میں کہیں "متحدہ قومیت کے دامِ ہمرنگ زمین میں کبوترِ حرم کو پھانسنے کی تجویزیں ہو رہی تھیں۔ کہیں کسی منبر سے یہ آواز آ رہی تھی کہ قومیں مذہب سے نہیں اوطان سے بنتی ہیں۔ اور یوں اس طائرِ لاہوتی کے بال و پر کو غبار آلودۂ ارض و بوم بنا کر امتِ رسولؐ کافۃ الناس کو جغرافیائی حدود کی آب و گِل میں محبوس کیا جا رہا تھا۔ کہیں "امرھم شوریٰ بینھم" کی حامل قوم کی نگاہوں میں مخلوط انتخاب کے سراب کو آبِ حیوان بنا کر دکھایا جا رہا تھا۔ کہیں اس "اولی الامر منکم" کی مامور جماعت کے لئے غیر مسلموں کی امامت و قیادت کو عین دین قرار دیا جا رہا تھا۔ کہیں انگریز کے خلاف "متحدہ محاذ" کے طلسم سے کفار و مشرکین سے دوستی کے جواز کے فتاویٰ شائع ہو رہے تھے۔ ایک طرف ایک مفتیٔ آتش نفس سرودِ گاہِ دار و دھا کی مستعار لے میں یہ خواب آور گیت گا رہا تھا کہ عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود ہیں[2]۔ اسلئے اسلام کو کسی دوسرے مذہب

---

[1] حضرت علامہ اقبال رحمتہ اللہ علیہ۔　[2] ابوالکلام آزاد۔

کوئی فوقیت نہیں۔ دوسری طرف کچھ خدادندانِ مکتب، شاہین بچوں کے لئے احساسِ کمتری کی ایک تعلیم کی اسکیمیں تیار کر رہے تھے۔

ہندو اپنے ذہن میں "رام راج" کے قیام کے منصوبے باندھ رہا تھا۔ اور اس کے لئے انگریز سے شریفانہ معاہدے (GENTLEMAN'S AGREEMENT) استوار کر رہا تھا۔ ہندوؤں کے شور و غوغا سے متاثر انگریز بھی مسلمانوں کو بلا تامل ہندو کے ہاتھ میں دے دینے پر آمادہ تھا۔ کہ وہ اپنی پانچ ہزار سالہ غلامی کا جذبۂ انتقام اس کے خون سے ٹھنڈا کرے۔ جو لوگ اغیار کے صفوں میں کھڑے ہو کر ملتِ اسلامیہ کی نمائندگی کا دعوےٰ کر رہے تھے۔ ان میں اتنا سمجھنے کی بھی استطاعت نہیں تھی کہ بساطِ سیاست پر یہ آئینی مہرے کس طرح چلائے جا رہے ہیں۔ ہندو خوش تھا کہ میں نے دس کروڑ فرزندانِ توحید کو اچھوتوں کی صف میں ملا دیا۔ انگریز راضی تھا کہ وہ خنجرِ ہلال جس کے بے نیام ہونے کے خوف سے کلیجۂ صلیب میں ہمیشہ دھڑکن رہتی تھی اسے گنگا کی لہروں میں بہا دیا گیا کہ اس کس مپرسی کے عالم میں اور اس انتشار و تشتت کے وقت آپ آگے بڑھے۔ اور ہندوؤں اور انگریزوں کے ہر خفیہ منصوبے اور ہر پوشیدہ سازش کو ایک ایک کر کے بے نقاب کر دیا۔ اور یوں ان کے تصورات کی حسین دنیا کو ایک خوابِ پریشان میں تبدیل کر کے رکھ دیا۔ اور ساری دنیا پر اس حقیقتِ عظمیٰ کو واضح کر دیا کہ

آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا

بطلِ جلیل القدر!

ہمیں خوب احساس ہے کہ آپ کی منزل کس قدر کٹھن اور راستہ میں کس قدر مشکلات کا سامنا ہے۔ جہاں تک غیروں کا تعلق ہے مسلمان جیسی منتشر قوم کے مقابلہ میں ہندوستان اور برطانیہ کی دو بڑی قوتوں کا متحدہ محاذ ہی کچھ کم سنگِ گراں نہیں لیکن غیروں سے کہیں زیادہ مہیب اور جانگداز مشکلات خود اپنوں کی پیدا کردہ ہیں۔ ان "اپنوں" کو بھی چھوڑیئے جو محض اپنی سنہری اور روپہلی مصلحت کوشیوں کی خاطر نشرگاہ دار دھا (RADIO STATION) کے آلات مکبر الصوت (LOUD SPERKERS) بنے ہوئے ہیں۔ وہ تو اس مخالفت پر مجبور ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ ماتم تو ان "مخلص منافقین" کا ہے۔ جن کی رفاقت و حمایت بیش ازیں نیست کہ

کافر نتوانی شد، ناچار مسلماں شو

جن کا مقصد وحید اپنے طرۂ وجاہت کا قیام و بقا ہے۔ خواہ یہ آستانۂ خواجہ یثرب سے وابستگی ظاہر کرنے سے حاصل ہو جائے یا لشکرِ بولہبی میں شمولیت سے۔ بایں ہمہ نہ ان غیروں کا ہجوم مخالفت ایسا ہے کہ اس سے کچھ خوف کھایا جائے۔ اور نہ اپنوں میں سے بعض کی نوازشہائے بیجا اور دوسروں کے طعنہ ہائے دلخراش ایسے کہ ان کا غم کھایا جائے۔ کہ جو حق پر ہو اسے کسی کی مخالفت کی کیا پرواہ ہو سکتی ہے۔

رہے ہیں اور ہیں فرعون تیری گھات میں اب تک
مگر کیا غم کہ تیری آستیں میں ہے یدِ بیضا

ؔ شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب

حریت مآب !

ہمیں اس بات کا بھی علم ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ تگ و دو حیات میں جو نصب العین آپ کے سامنے ہے وہ وہی ہے جو ہر مسلمان کی نگاہوں کے سامنے ہونا چاہیئے۔ جس کے دل میں بہ حیثیت مسلمان زندہ رہنے کی تڑپ اور اپنی نسلوں کو بہ حیثیت مسلمان رکھنے کی آرزو موجزن ہے۔ اور کسے معلوم نہیں کہ وہ نصب العین ہندوستان کے اندر ایک اسلامی ہند (MUSLIM-INDIA) کی تشکیل کے سوا اور کچھ نہیں، جس طرح آپ احوال و ظروف کا صحیح جائزہ لیتے ہوئے قدم بقدم اس درخشندہ نصب العین کی طرف بڑھتے جا رہے ہیں۔ وہ آپ کی بلند نگہی اور حسن تدبر کا آئینہ دار ہے۔ سطح بیں لوگوں نے آپ کو صرف ایک فاضل سقنن اور دیدہ ور مدبر کی حیثیت سے ہی پہنچانا ہے۔ لیکن جن لوگوں کو آپ کے قریب ہونے کی سعادت نصیب ہوئی ہے۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ مبدء فیض نے آپ کو اس قدر ذہن رسا کے ساتھ ساتھ کس قدر دلِ سوز دپرورد کی نعمتوں سے نوازا ہے۔

خرد نے تجھ کو عطا کی نظر حکیمانہ
سکھائی عشق نے تجھ کو حدیث رندانہ

اور قلب و نظر اور عشق و عقل کا یہی امتزاج ہے جو ایک ناخدائے کشتیٔ ملت کی متاع گراں بہا ہے۔

نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پرسوز
یہی ہے رخت سفر میر کارواں کے لئے

عالی مرتبت !

آپ یقین فرمایئے کہ جس قوم کی فلاح و بہبود آپ کی زندگی کا منتہی ہے۔ اس قوم کا سوادِ اعظم آپ کی قیادت و امارت پر کامل بھروسہ رکھتا ہے۔ اور ان کی خاطر آپ نے جو گرامی قدر قربانیاں دی ہیں۔ ان کے دل میں ان کا پورا پورا احساس ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ سرزمین پنجاب جو ملت اسلامیہ کے اس اجتماع عظیم کی تقریب پر آپ کی تشریف آوری سے سرفراز ہونے والی ہے۔ اس میں آئینی نقطۂ نگاہ سے (CONSTITUTIONALLY) ابھی پراونشل لیگ کا قیام بھی عمل نہیں آ سکا۔ لیکن ہمیں امید ہے کہ یہ حقیقت آپ کی نگاہ سے مستور نہ ہوگی کہ پنجاب کا ایک ایک قریہ اور اس قریہ کے ایک ایک فرد کا دل آپ کی عظمت و عقیدت کا نشیمن بنا ہوا ہے۔ بس کسی ایک مرد خود آگاہ و خدا دوست کے نعرہ مستانہ کی دیر ہے۔ یہ طوفان بلا انگیز کسی سے روکے نہیں رُکے گا۔ اس وقت بچے گا وہی جو کشتیٔ ملت میں اخلاص و دیانت سے سوار ہوگا۔ اور پکارنے والا پکارے گا کہ

لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ أَمْرِ اللهِ إِلَّا مَنْ رَحِمَ

سید القوم !

ادارۂ طلوع اسلام۔ جسے ہزارہا پرخلوص اور صحیح النظر مسلمانوں کی ترجمانی کا فخر حاصل ہے۔ اجلاس لیگ

کی صدارت پر آپ کی خدمت میں ہدیۂ تبریک و تہنیت پیش کرتا ہے۔ اور مستدعی ہے کہ جس نصب العین کی طرف آپ کا قدم اٹھ رہا ہے۔ قوم کو اس کی طرف اور تیز گامی سے بڑھاتے جائیے۔ اس نصب العین کے حصول کے لئے اگر ضرورت پیش آئی تو آپ دیکھیں گے کہ قوم کس طرح کفن بردوش و سر بکف آپ کی دعوت پر لبیک کہتی ہے۔

بانگِ درویشی در ساز و دمادم زن ؛
چوں پختہ شوی خود را بر سلطنت جم زن

اراکین ادارۂ "طلوع اسلام"

اس عظیم الشان تاریخی اجلاس میں ۲۳ مارچ سنہ ۱۹۴۰ء کو وہ ریزولیوشن پاس ہوا، جس میں پاکستان کو مسلمانانِ ہند کی ملی سرگرمیوں کا نصب العین قرار دیا گیا۔ یہ ہے ۲۳ مارچ کی تاریخی اہمیت۔ اس ریزولیوشن سے جہاں غیر مسلموں کے دل میں تشویش واضطراب کی ایک آگ بھڑک اٹھی۔ وہاں مسلمانوں کے دل میں فطری طور پر اس قسم کے سوالات پیدا ہونے شروع ہو گئے کہ پاکستان میں اسلامی حکومت کے قیام سے مقصود کیا ہے؟ اس حکومت کی اصل بنیاد کیا ہوگی؟ اور غرض و غایت کیا؟ اس حکومت میں اور دنیا کی دوسری حکومتوں میں فرق کیا ہوگا۔ یہ تھے وہ سوالات جو صدر مسلم لیگ (قائد اعظم مرحوم) سے ۱۹۴۱ء میں حیدرآباد (دکن) کے چند نوجوانوں نے پوچھے۔ سوالات اور ان کے جواب حسب ذیل تھے۔

سوال:۔ مذہب اور مذہبی حکومت کے لوازم کیا ہیں؟

جواب:۔ جب میں انگریزی زبان میں مذہب کا لفظ سنتا ہوں تو اس زبان اور قوم کے محاورے کے مطابق لامحالہ میرا ذہن خدا اور بندے کی باہمی نسبت اور رابطہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ لیکن میں بخوبی جانتا ہوں کہ اسلام اور مسلمانوں کے نزدیک مذہب کا یہ محدود اور مقید مفہوم یا تصور نہیں ہے۔ میں نہ کوئی مولوی ہوں نہ ملا۔ نہ مجھے دینیات میں مہارت کا دعویٰ ہے۔ البتہ میں نے قرآن مجید اور قوانینِ اسلامیہ کے مطالعہ کی اپنے طور پر کوشش کی ہے۔ اس عظیم الشان کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔ زندگی کا روحانی پہلو ہو یا معاشرتی، سیاسی ہو یا معاشی، غرضیکہ کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے احاطہ سے باہر ہو۔ قرآن کریم کی اصولی ہدایات اور سیاسی طریق کار نہ صرف مسلمانوں کے لئے بہترین ہیں بلکہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے لئے حسنِ سلوک اور آئینی حقوق کا جو حصہ ہے اس سے بہتر تصور ناممکن ہے۔

سوال:۔ اس سلسلہ میں اشتراکی حکومت وغیرہ کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب:۔ اشتراکیت، بالشویکیت، یا دیگر اسی قسم کے سیاسی اور معاشی مسلک در اصل اسلام اور اس کے نظام

سیاست کی غیر مکمل اور بھونڈی سی نقلیں ہیں۔ ان میں اسلامی نظام کے اجزاء کا سا رابطہ اور تناسب و توازن نہیں پایا جاتا۔

سوال:- ترکی حکومت تو ایک سیکولر اسٹیٹ ہے کیا اس سے اسلامی حکومت مختلف ہے؟ آپ کا اس باب میں کیا خیال ہے؟

جواب:- ترکی حکومت پر میرے خیال میں مادی حکومت (SECULAR STATE) کی سیاسی اصطلاح اپنے پورے مفہوم میں منطبق نہیں ہوتی۔ اب رہا اسلامی حکومت کے تصور کا امتیاز سو یہ بالکل واضح ہے۔ اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز پیش نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کے لئے تعمیل کا مرکز قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے، نہ کسی پارلیمان کی، نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی، قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے۔ اور حکمرانی کے لئے (آپ جس نوعیت کی بھی چاہتے ہوں) بہرحال آپ کو علاقہ اور سلطنت کی ضرورت ہے۔

سوال:- وہ سلطنت ہمیں ہندمیں کس طرح نصیب ہو سکتی ہے۔؟

جواب:- مسلم لیگ، اس کی تنظیم، اس کی جدوجہد، اس کا رخ۔ اس کی راہ۔ سب اس سوال کے جواب ہیں۔

سوال:- جب آپ اسلامی اصول کے نصب العین اور طریق کار دونوں میں بہترین اور برترین حکومت کا یقین رکھتے ہیں۔ اور عملاً یہ بھی کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو خود مختار علاقے اس لئے مطلوب ہیں کہ وہاں وہ اپنے ذہنی میلانات اور تصورات زندگی کو بلا روک ٹوک بروئے کار اور روبہ ترقی لاسکیں۔ تو پھر اس میں کون سا امر مانع ہے کہ مسلم لیگ زیادہ تفصیل اور توضیح کے ساتھ اپنی جدوجہد کی مذہبی تعبیر و تشریح کردے۔

جواب:- روقت یہ ہے کہ جب اس جدوجہد کو مذہب سے تعبیر کیجئے تو ہمارے علماء کی ایک جماعت بغیر اس بات کے سمجھنے کے کہ کام کی نوعیت، تقسیم عمل اور اس کے اصل و حدود کیا ہیں۔ ان امور کو صرف چند مولویوں کا اجارہ خیال کرلیتی ہے۔ اور (اپنے حلقہ سے باہر) اہلیت و استعداد کے باوجود مجھ میں یا آپ میں (یعنی کسی اور میں) اس خدمت کے سرانجام دینے کی کوئی صورت نہیں دیکھتی۔ حالانکہ اس منصب کی بجاآوری کے لئے جن اجتہادی صلاحیتوں کی ضرورت ہے۔ انہیں میں ان مولوی صاحبان میں (الا ماشاءاللہ) نہیں پاتا (اور پھر مشکل اندر مشکل یہ کہ) وہ اس مشن کی تکمیل میں دوسروں کی صلاحیتوں سے کام لینے کا سلیقہ بھی نہیں رکھتے۔

ان جوابات سے واضح ہے کہ حصول پاکستان کی جدوجہد میں قائد تحریک کے ذہن میں آئین و نظام پاکستان کا کیا نقشہ تھا؟

اب مسلم لیگ کی تحریک ایک متعین نصب العین کو سامنے رکھ کر آگے بڑھی۔ یہ تحریک کس کس نشیب و فراز سے گذری۔ اس کی تفصیل

طول طویل ہے (خدا کرے کہ ہماری اس ملی جدوجہد کی پوری تاریخ قلمبند ہو جائے، تو اس میں ان جانگداز مراحل کا تفصیلی تذکرہ سامنے آ جائے) اس کے چند اہم مقامات حسب ذیل ہیں۔

کرپس تجاویز اور مابعد

۲۳ مارچ ۱۹۴۲ء کو حکومت برطانیہ نے سر سٹیفورڈ کرپس کو چند تجاویز دے کر ہندوستان بھیجا تاکہ وہ ان کی بنا پر مساعیٔ جنگ کے لئے اہل ہند کا تعاون حاصل کر سکیں۔ ان تجاویز میں پہلی مرتبہ پاکستان کے اصولوں کو تسلیم کیا گیا۔ کانگریس نے (جیسا کہ ظاہر ہے) ان تجاویز کو مسترد کر دیا۔ اور اگست ۱۹۴۲ء میں حکومت کے خلاف عام بغاوت کی تحریک شروع کر دی۔ تاکہ وہ اس سے مرعوب ہو کر اصول پاکستان کو مسترد کر دے۔

مسٹر راجہ گوپال اچاریہ اصول پاکستان کے حق میں تھے۔ انہوں نے اپریل ۱۹۴۴ء میں ایک فارمولا پیش کیا۔ تاکہ اس کی بنیادوں پر لیگ اور کانگریس میں مفاہمت ہو سکے۔ ۳۰ جولائی ۱۹۴۴ء کو مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں قائد اعظم مرحوم نے اس فارمولے کا تجزیہ کر کے بتایا کہ وہ کس طرح کانگریس کی قائدانہ حیثیت تسلیم کرنے کی عیارانہ کوشش ہے۔ ستمبر ۱۹۴۴ء میں مسٹر گاندھی اور قائد اعظم میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی باہمی مفاہمت کے سلسلہ میں مذاکرات شروع ہوئے۔ جو ناکامی پر منتج ہوئے۔ ۱۹۴۵ء کے آغاز میں مرکزی اسمبلی کانگریس پارٹی کے لیڈر مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی اور محترم لیاقت علی خاں مرحوم نے ایک فارمولا تیار کیا جس میں پہلی بار دو قوموں کے نظریہ کو تسلیم کیا گیا۔ وائسرائے ہند لارڈ ویول، اس فارمولا کی روشنی میں آئینی تعطل کو دور کرنے کے لئے لندن گئے۔ اور انہوں نے جون ۱۹۴۵ء کو اپنی تجاویز کا اعلان کر دیا۔ کانگریس ان پر بھی رضامند نہ ہوئی۔

۵ مارچ ۱۹۴۶ء کو لندن سے ایک وزارتی مشن ہندوستان بھیجا گیا۔ جس نے ملک کے مختلف نمائندوں سے بات چیت کے بعد ۱۶ مئی ۱۹۴۶ء کو اپنا فیصلہ شائع کر دیا۔ مسلم لیگ نے اسے بھی منظور کر لیا۔ لیکن کانگریس نے پہلے اسے تسلیم کر لیا۔ اور بعد میں اسے مسترد کر دیا۔

۲۰ فروری ۱۹۴۷ء کو حکومت برطانیہ نے اعلان کیا کہ ہندوستان کے اختیارات کلی عنقریب اہل ہند کے حوالے کر دیئے جائیں گے ۳ جون ۱۹۴۷ء کو ان نئی تبدیلیوں کا تاریخی اعلان ہوا۔ ان کے مطابق ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان عملاً وجود میں آ گیا۔ ۱۸ اگست کو کراچی میں آزادی کی پہلی عید منائی گئی۔ (اور اسی تاریخ سے ہندوستان میں مسلمانوں کی قربانیاں شروع ہو گئیں)

اب قریب ساڑھے آٹھ سال کے بعد پاکستان کا آئین منظور ہوا ہے۔ اس آئین کے نفاذ کے لئے ۲۳ مارچ کی تاریخ مقرر کی گئی ہے۔ کیونکہ ۱۹۴۰ء میں اسی تاریخ کو پاکستان کا سنگ بنیاد رکھا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ اس مملکت کو استحکام و عروج عطا فرمائے۔ اور ہمیں اس قابل بنائے کہ ہم اس میں صحیح اسلامی نظام قائم کر سکیں۔ کہ حصول پاکستان کی اصل غایت یہی ہے۔ باقی بتانِ آذری۔

اب آپ سمجھے کہ ہماری ملی سرگزشت میں ۲۳ مارچ کی تاریخ کس قدر اہمیت رکھتی ہے۔ اس تاریخ کو بجا طور پر ہمارا ملی شعار قرار پانا چاہیئے۔ وللہ الحمد۔

مجلس اقبال

مثنوی اسرار خودی

باب ہشتم

در حقیقت شعر و اصلاح ادبیات اسلامیہ

گذشتہ باب میں علامہ اقبال اس حقیقت کو بیان کر چکے ہیں کہ تصوف، جو قوموں کی رگ حیات میں خون گرم کو یخ بستہ کر کے ان کے قلوب کو سوز آرزو اور ان کے سینوں کو ولولہ عمل سے محروم کر دیتا ہے، اپنی اصل کے اعتبار سے ذہن افلاطونی کی ایجاد ہے جس کے افسون خواب آور کا اثر یہ ہے کہ اڑھائی ہزار سال سے قوموں کی قومیں ذوق عمل سے بے گانہ ہو کر تباہی کے جہنم میں گرتی چلی گئی ہیں، اور چلی جا رہی ہیں۔ زیر نظر باب میں وہ اس امر کی وضاحت کرتے ہیں کہ تصوف کا سب سے بڑا اثر قوموں کے شعر و ادب پر ہوتا ہے بلکہ یوں کہئے کہ تصوف کا زہر پھیلتا ہی شاعری کے ذریعے ہے۔ تصوف کی عمارت حقائق کی بجائے لطائف پر استوار ہوتی ہے۔ حقائق کا اثبات، دلیل و برہان اور علم و بصیرت کی رو سے ہوتا ہے لیکن لطائف بعض تشبیہات، و استعارات کے زور پر اپنے آپ کو حقیقت ثابتہ کے رنگ میں پیش کرتے ہیں۔ مثلاً تصوف کا ایک بنیادی نقطہ یہ ہے کہ کوئی شخص براہ راست جلوہ خداوندی سے بہرہ یاب نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے مرشد کی وساطت کی ضرورت ہے۔ وہ اپنے اس دعوے کو دلیل و برہان کی رو سے ثابت نہیں کرتا بلکہ کہتا یہ ہے کہ اگر تم سورج کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھو تو آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں تم اس کے جلال کی تاب نہیں لا سکتے۔ تم اسے نظر بھر کر دیکھ ہی نہیں سکتے۔ لیکن اگر پانی کا پیالہ بھر کر اس میں سورج کا عکس دیکھا جائے تو اس کا پورا قرص سامنے آجاتا ہے اور اس کا مشاہدہ کرنے میں آنکھوں کو ذرا بھی دقت نہیں ہوتی۔ اسی طرح جب تم جلال خداوندی کو مرشد کے آئینہ جمال کی وساطت سے دیکھو تو وہی جلوہ جو اس سے پہلے نظارہ سوز تھا ـــ قرۃ العین بن جائے گا۔

آپ نے دیکھا کہ اس ایک تشبیہ نے ذہن کو کس طرح ماؤف کر دیا اور تصوف کا وہ دعوےٰ جو علم و برہان کی رو سے کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتا، کس طرح ایک مثبت حقیقت بن کر دکھائی دینے لگا۔ تصوف کی ساری عمارت اسی قسم کے لطائف کے آسرے پر

قائم ہوتی اور تشبیہات و استعارات کے سہاروں پر کھڑی رہتی ہے۔ اسی طرح ادب و شعر، تصوف کے خدام کی حیثیت سے اس کے سحر کو عام کرتے رہتے ہیں۔ علی حزیں نے تو کہا تھا کہ تصوف برائے شعر گفتن خوب است۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ شعر ہم برائے تصوف لاینفک است۔ لہٰذا جو قوم زندگی اور اس کی حرارتوں سے بہرہ یاب ہونا چاہے۔ اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ سب سے پہلے اپنے لٹریچر کو ان جراثیم سے پاک و صاف کرے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتی تو اس کی کوئی کوشش صحیح نتیجہ پیدا نہیں کر سکتی۔

اس مقام پر اس نکتہ کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ ادب اور شعر، بجائے خویش کچھ حقیقت نہیں رکھتے۔ یہ محض اظہار خیال کا ذریعہ ہیں۔ لہٰذا اگر کسی قوم کا ادب فالج زدہ ہے تو اس سے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اس قوم کے تخیلات پر موت کا کابوس سوار ہے۔ یا اگر کسی قوم کے تصورات زندگی میں توانائی اور حرارت نہیں، تو اس کا ادب ایک بیوہ کی نوحہ گری سے زیادہ کچھ نہیں ہوگا۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جو قوم نکبت و زوال کے قبرستانوں کی طرف کھنچی جارہی ہو، اس کے افراد ہمیشہ ان اشعار پر سر دھنیں گے جن میں انتہائی درجہ کا حزن و یاس اور درد و الم ہو۔ جو پژمردگی و افسردگی کی کفن پوش تصویریں ہوں۔ ان کے شاعروں میں وہ شاعر سب سے زیادہ داد کا مستحق سمجھا جائے گا جو ایک سو آہ کھینچ کر کراہتے ہوئے اٹھے اور دونوں ہاتھوں سے کلیجہ تھام کر کہے کہ حضور!

عالم کی فضا پوچھو محروم تمنا سے

بیٹھا ہوا دنیا میں اٹھ جائے جو دنیا سے

حتیٰ کہ اس دعوے کو بطور کلیہ کے پیش کیا جاتا ہے کہ ادب و شعر کو اپنے نقطۂ عروج تک پہنچتے ہی زمانۂ انحطاط میں ہیں۔ زیر نظر باب میں علامہ اقبال نے اسی فریب کی نقاب کشائی کی ہے اور کھلے کھلے الفاظ میں بتایا ہے کہ جو ادب رزمگاہِ حیات سے فرار کی راہیں سکھاتا اور قلب انسانی کو جوشش عمل و کردار سے بیگانہ بناتا ہے، وہ ادب نہیں، برگ حشیش بلکہ نوید مرگ ہے۔ اس لئے کہ

گرم خوں انساں ز داغِ آرزو

آتش ایں خاک از چراغِ آرزو

آرزو۔ یعنی مقصد کے حصول کی تڑپ ہی وہ قوت و حرارت ہے جس سے انسان کی رگوں میں زندہ اور گرم خون دوڑتا ہے۔ آرزو ہی وہ چراغ ہے جس کی حرارت سے یہ خاک کا پتلا، آتش کا پرکالہ بن جاتا ہے۔

از تمنائے بجام آمد حیات

گرم خیز و تیز گام آمد حیات

اگر زندگی تمنا سے بیگانہ ہو جائے تو وہ ایک ایسے ساغر کی طرح ہو جاتی ہے جو شراب سے خالی ہو۔ زندگی اگر محفل کائنات میں مے بجام آتی ہے تو اس کی یہ کیفیت آرزو ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کی قوت سے وہ برق رفتاری کے ساتھ اپنے ارتقائی مراحل طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی اور اوپر کو اٹھتی چلی جاتی ہے۔ (اس کے برعکس تصوف کی تلقین یہ ہے کہ سب سے بڑی متاع " دل بے مدعا " ہے!) حقیقت یہ ہے کہ

زندگی مضمونِ تسخیر است و بس
آرزو افسونِ تسخیر است و بس

زندگی کا مقصود و غایت، تسخیرِ کائنات ہے۔ بلکہ یوں کہئیے کہ زندگی عبارت ہی اس سے ہے کہ انسان نفس و آفاق کی قوتوں کو سخر کرتا چلا جائے اس تسخیر کائنات کے لئے ایک ہی "سحر اور تعویذ" ہے۔ اور وہ ہے ـــ آرزو

زندگی صید افگن و دامِ آرزو
حسن را از عشق پیغامِ آرزو

زندگی کا کام یہ ہے کہ وہ کائنات کے تمام عناصر کو شکار کرتی چلی جائے۔ لیکن شکار بغیر جال کے ممکن نہیں۔ زندگی کے پاس وہ دام جس سے وہ ہر شے کو شکار کر سکتی ہے، آرزو ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جس شکاری کے پاس جال ہی نہ ہو وہ شکار کیا کر سکے گا؟

دوسرا مصرعہ بڑا ہی خوبصورت ہے جس میں کہا گیا ہے کہ عشق حسن کی طرف ایک ہی پیغام بھیجتا ہے۔ اور وہ پیغام ہوتا ہے۔ آرزو۔ عشق درحقیقت نام ہی آرزو کا ہے۔ اگر آرزو کی چنگاری باقی نہ رہے تو شعلۂ عشق خود بخود بجھ جاتا ہے۔

اب سوال یہ سامنے آتا ہے کہ آرزو کس چیز سے پیدا ہوتی ہے؟ عشق کی خلاق تو آرزو ہے لیکن آرزو کی تخلیق کس سے ہوتی ہے؟

از چہ رو خیزد تمنا دمبدم
ایں نوائے زندگی را زیر و بم

آرزو جس سے سرودِ حیات میں زیر و بم پیدا ہوتا ہے۔ جس سے جوئے زندگی متموج و متلاطم ہوتی ہے۔ یہ دمبدم پیدا کس چیز سے ہوتی ہے؟ سوال آپ نے سن لیا۔ اب اس کا جواب دیکھئے۔ ارشاد ہے

ہر چہ باشد خوب زیبا و جمیل	در بیابانِ طلب مارا دلیل
نقش او محکم نشیند در دلت	آرزو ہا آفریند در دلت

کائنات میں ہر حسین و جمیل شے میدانِ طلب میں ہماری راہ نمابن جاتی ہے۔ ہم اگر کسی صحرا میں راہ گم کردہ کھڑے ہوں یا راستہ کھو کر تھکے ماندے کسی درخت کے سایہ تلے سستا رہے ہوں کہ اتنے میں دُور سے کوئی نہایت حسین و جمیل شے دکھائی دے تو وہ ایک تبسم زیر لبی سے، آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کر دیتی ہے کہ ـــ جا اینجاست۔ اور انسان، تازہ ولولوں کی ایک نئی دنیا اپنے آغوش میں لئے اس کے حصول کے لئے والہانہ انداز سے پھر جادہ پیما ہو جاتا ہے۔ لہذا

حسن خلاقِ بہارِ آرزو ست
جلوہ اش پروردگارِ آرزو ست

حسن خود ہی بہار آرزو کا خلاق ہے اسی کا جلوہ اس کا پروردگار ہے۔ حسن خود آرزو کو بیدار کرتا ہے جس سے شرارِ عشق کی نمود ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن بار بار اس امر پر زور دیتا ہے کہ تم جلوہ گاہ کائنات کا بغور مشاہدہ کرو۔ تمہیں اس کے ایک ایک

ذرہ میں حسن و زیبائی کارفرما نظر آئے گی اور یہی حسن تمہارے دل میں آرزوؤں کو بیدار کر دے گا۔ جس سے ذوقِ عمل کی نمود ہوگی۔

بات یہاں تک پہنچی ہے کہ زندگی نام ہے آرزو کا۔ اور آرزو پیدا ہوتی ہے خود حسن سے اور

سینۂ شاعر تجلی زارِ حسن

خیزد از سینائے او انوارِ حسن

حسن کی جلوہ گاہ شاعر کا دل ہے۔ یہی وہ طور ہے جس سے انوارِ حسن اُٹھ کر انفس کائنات کو آئینہ پوش بنا دیتے ہیں۔

اس سے واضح ہے کہ اقبال کے نزدیک شاعر کون ہے؟ وہ جو حسنِ کائنات کو سب سے زیادہ شدت سے محسوس (APPRECIATE) کرے۔ یہ ظاہر ہے کہ حسن کائنات کی تحسین (APPRECIATION) محض جذبات سے نہیں ہو سکتی۔ حسن نام ہے توازن و تناسب (BALANCE AND PROPORTION) کا۔ اور اشیائے کائنات کا لطیف و عمیق توازن اسی صورت میں بے نقاب ہو کر سامنے آسکتا ہے۔ جب انسان قانونِ فطرت کی گہرائیوں تک پہنچ کر اس حقیقت کا بچشمِ خویش مشاہدہ کرے کہ ماتریٰ فی خلق الرحمن من تفٰوت (۶۷/۳) تخلیق خداوندی میں کہیں عدم توازن نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ چیز انتہائی غور و فکر کے بعد ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ لیکن اس غور و فکر کے بعد جس کی بنیاد تجربات و مشاہدات پر ہو۔ نہ کہ محض تصورات پر۔ ان تصریحات سے آپ خود سوچئے کہ "تجلی زارِ حسن" کس کا سینہ ہو سکتا ہے اور جسے علامہ اقبال نے شعر کی زبان میں "شاعر" کہہ کر پکارا ہے۔ اسے دنیائے محسوسات میں کس نام سے تعبیر کیا جائے گا؟ ماہرِ علومِ فطرت جس کی فکر پاکیزہ ہو۔ واضح رہے کہ قرآن نے (مومنین کے لئے) "علماء" کا لفظ ایک ہی مقام پر استعمال کیا ہے اور وہاں اس سے مراد ماہرینِ علومِ فطرت ہی ہیں۔ (ملاحظہ ہو ۳۵/۲۷-۲۸)

اس قسم کے "شاعر" کے متعلق کہا ہے کہ

از نگاہش خوب گردد خوب تر

فطرت از افسونِ او محبوب تر

اس کی نگاہ، اشیائے کائنات کے حسن میں نت نئے اضافے کرتی رہتی ہے۔ وہ ایسا سحر پھونکتا ہے کہ اس سے عروسِ فطرت محبوب سے محبوب تر بنتی چلی جاتی ہے۔ اس کے تجربات، فطرت کے جمالِ مستور کی نقاب کشائی کرتے چلے جاتے ہیں اور اس کی چابکدستی اس کی مشاطگی میں مصروف رہتی ہے۔

از دمش بلبل نوا آموختہ است

غازہ اش رخسارِ گل افروختہ است

جذبات کی دنیا کی طرف آئیے تو یہی وہ لوگ ہیں جن سے بلبل نے نواسنجی سیکھی ہے۔ اور انہی کا غازہ، عارضِ گل کی سرخی کا موجب بنتا ہے یعنی عشق کی آتش بھی انہی سے بھڑکتی ہے اور حسن کی رنگینی بھی انہی سے اُبھرتی ہے

سوز او اندر دلِ پروانہ ہا
عشق را رنگیں از و افسانہ ہا

پروانے کے دل میں جو سوز وتپش نظر آتی ہے وہ بھی انہی سے ہے اور افسانۂ عشق کی رنگ آمیزی بھی انہی کے دم قدم سے

بحر و بر پوشیدہ در آب و گلش
صد جہانِ تازہ مضمر در دلش

یہی وہ مردِ حساس و بالغ نظر ہے جس کے آب و گل میں بحر و بر پوشیدہ ہوتے ہیں۔ ہر آن اس کے دل میں ایک نئی دنیا مضمر ملتی ہے۔ اس لئے کہ وہ رموزِ فطرت کو آشکارا کرنے اور حسن کائنات میں نادرہ کار اضافوں میں مصروفِ عمل رہتا ہے۔ اس کے تخیل (IMAGINATION) اور دور بینی (FAR-SIGHTEDNESS) کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ

در دماغش نادمیدہ لالہ ہا
ناشنیدہ نغمہ ہا ہم نالہ ہا

وہ پھول جو ابھی شاخ کے پردوں میں پنہاں ہوتے ہیں، اس کے ذہن میں موجود ہوتے ہیں، اور وہ نغمہ ہائے شادی اور نوحہ ہائے غم سینوں میں مستور ہوں اور کسی کے لب تک بھی نہ آئے ہوں، اس کا قلب انہیں بھی سن لیتا ہے۔ یہ تو رہا اس کے احساس کی وسعتوں اور گہرائیوں کا حال۔ باقی رہی اس کی رفعتِ فکر۔ سو اس کی کیفیت یہ ہے کہ

فکر او با ماہ و انجم ہم نشیں
زشت را نا آشنا۔ خوب آفریں

اس کی فکر چاند اور تاروں سے ہم گوش رہتی ہے اور سب سے بڑی خصوصیت یہ کہ وہ ہمیشہ حسن و خیر کی تخلیق کرتا ہے، شر اور زشت سے واقف ہی نہیں ہوتا۔ یعنی خالی فکر کی بلندی ہی نہیں بلکہ قلب و نظر کی پاکیزگی بھی اس کے ساتھ ہوتی ہے۔ پھر، اس کی یہ فکر و نظر صرف اس کی اپنی ذات تک محدود نہیں رہتی بلکہ اس سے وہ نوعِ انسانی کی راہ نمائی کرتا ہے۔

خضر و در ظلمات او آبِ حیات
زندہ تر از آبِ چشمش کائنات

وہ خضرِ راہ بنتا ہے اور جو اس کے بتائے ہوئے راستے پر چلتا ہے وہ حیاتِ جاوید کے چشمہ تک جا پہنچتا ہے۔ نوعِ انسانی کے درد و غم میں اس کی آنکھ سے جو آنسو ٹپکتا ہے اس سے مزرعِ کائنات کی سیرابی ہوتی ہے۔ اور وہ زندہ سے زندہ تر ہو جاتی ہے

ما گراں سیریم و خام و سادہ ایم
در رہِ منزل ز پا افتادہ ایم

اگر اس کی راہ نمائی میسر نہ ہو تو انسانیت راستوں میں ٹھوکریں کھاتی پھرے۔ سفرِ حیات میں اس کا ایک ایک قدم من من بھر کا

ہو جائے۔ ہر رہزن متاع ہستی اس کی ناپختگی اور سادہ لوحی سے فائدہ اٹھا کر اسے لوٹ لے۔ اس کی راہ نمائی کے بغیر ہم سب کا یہی حشر ہو۔ لیکن وہ ایسا نہیں ہونے دیتا۔

عندلیب او نوا پرداخت است		حیلۂ از بہر ما انداخت است

تا کشد ما را بفردوس حیات		حلقۂ کامل شود قوس حیات

وہ اپنی عندلیب خوش نوا کو راستہ میں چھوڑ دیتا ہے کہ وہ اپنے چہچہوں سے راستہ چلنے والوں کا دل لبھائے اور انہیں اپنے پیچھے لگائے اور اس طرح انہیں فردوس حیات کی طرف لے جائے۔ اور یوں زندگی کی کمان، نصف دائرہ رہنے کے بجائے، پورا حلقہ بن جائے۔ جس میں مبدا اور معاد (ابتدا و انتہا۔ آغاز و انجام) کے گوشے ایک دوسرے سے مل جائیں اور منزل اور راستہ میں کوئی فرق ہی نہ رہے۔

کاروان ہا را درایش گام زن

در پئے آواز نالیش گام زن

اس کا پیغام رحیل، کاروانِ انسانیت کو آمادۂ سفر کر دیتا ہے وہ اس کی نفیر کی آواز کے پیچھے پیچھے چلتا ہے اور اس طرح خراماں خراماں، شاداں و فرحاں منزلِ مقصود تک جا پہنچتا ہے۔

چوں نسیمش در ریاضِ ما وزد

نرمک اندر لالہ و گل می خزد

جب اس کی نسیم جاں فزا ہمارے چمنِ ہستی میں مست خرام ہوتی ہے تو وہ لالہ و گل کی نرم و نازک پتیوں تک میں غیر محسوس طور پر سرایت کر جاتی ہے اور اس طرح نہایت نرمی اور آہستگی سے پردوں کے اندر چھپی ہوئی تازگی کے لئے وجہ شگفتگی بن جاتی ہے۔ اس سے دلوں کی کلیاں کھلتی ہیں اور آرزوؤں کے غنچے چٹکتے ہیں۔

از فریب او خود افزا زندگی

خود حساب و ناشکیبا زندگی

اس کی سحر انگیزیوں اور کرشمہ خیزیوں سے زندگی میں افزائش و بالیدگی (SELF - DEVELOPMENT) پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ ایک ایک سانس میں اپنا محاسبہ کرتی رہتی ہے اور اس کے دل میں ہر وقت آرزو کی تڑپ موجزن رہتی ہے۔

اہلِ عالم را صلا بر خواں کند

آتشِ خود را چو باد ارزاں کند

اس کی یہ نوازشات کسی خاص گروہ، خاص جماعت، خاص خطہ ملک تک محدود نہیں رہتیں۔ وہ اپنے خوانِ نعمت پر ساری نوعِ انسانی

کو دعوت دیتا ہے۔ دعوت دینا کیا؛ وہ اسے اس طرح کھلا رکھتا ہے جس طرح ہوا ہر متنفس کے لئے ہر جگہ اور ہر وقت بلا قیمت موجود رہتی ہے ربوبیت عامہ اس کا مقصد حیات اور رحمۃ للعالمینی اس کا مطمح نگاہ ہوتا ہے۔

ان خصوصیات کو سامنے رکھئے اور پھر سوچئے کہ جس ہستی کو اقبال نے "شاعر" کے نام سے پکارا ہے، کیا اس سے مراد وہ شاعر ہیں جن کی غزلیں مشاعروں میں سنی جاتی ہیں؟ صاف ظاہر ہے کہ اقبال نے یہ ساری گفتگو استعارۃً کی ہے اور جسے اس نے "شاعر" سے تعبیر کیا ہے، وہ درحقیقت پیغامبر حیات ہے۔ اس زمرہ میں سب سے اوپر خود حضرات انبیاء کرام ہوتے ہیں اور ان کے نیچے ان کی اتباع میں، وہ تمام مصلحین، مفکرین اور ماہرین علوم فطرت جو انسانیت کو قوانین خداوندی سے آشنا کرتے اور انہیں زندگی کی غرض وغایت کا سراغ دیکر ان کے دل میں اس کے حصول کی تڑپ پیدا کرتے ہیں۔

ایک "شاعر" تو اس قسم کا ہوتا ہے اب دوسری قسم کے "شاعر" کا حال سنئے۔ واضح رہے کہ مثنوی کے سب سے پہلے ایڈیشن میں باب زیر نظر کی جگہ ایک اور باب تھا جس میں حضرت علامہ نے بتایا تھا کہ حافظ کی شاعری نے قوم کو کس قدر افیون زدہ بنا دیا اور اس سے کس درجہ احتیاط لازم ہے۔ ہماری شخصیت پرست قوم بھلا اس قسم کی تنقید کو کس طرح برداشت کر لیتی۔ متصوفین کے طبقہ نے اس کے خلاف طوفان برپا کر دیا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ مثنوی کے دوسرے ایڈیشن میں ان اشعار کو حذف کر دیا گیا اور ان کی جگہ زیر نظر باب نے لے لی اس باب کا جو حصہ اب سامنے آتا ہے، یہ اپنے مفہوم کے اعتبار سے وہی ہے، جو حافظ کے متعلق کہا گیا تھا۔ لیکن اس پر ان لوگوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا جنہوں نے حافظ سے متعلق اشعار پر کہرام مچا دیا تھا۔ اس سے بھی ظاہر ہے کہ اگر کسی کا نام لئے بغیر آپ اس پر کتنی ہی کڑی تنقید کر دیں تو قوم کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا لیکن جونہی آپ نے اسلاف میں سے کسی کا نام لیا، ان کے جذبات عقیدتمندی بھڑک اٹھے اور آپ کے خلاف شور مچ گیا۔ جو قوم سطحی جذبات میں بہہ چکی ہو اس کی کیفیت یہی ہو جاتی ہے۔ بہرحال دوسری قسم کے شاعر کے متعلق علامہ اقبال نے کہا ہے کہ

وائے قومے کز اجل گیرد برات

شاعرش وا بوسد از ذوق حیات

کس قدر بدبختی اور تباہی ہے اس قوم کی جس کا شاعر اسے ذوق حیات سے روگردانی اور حقائق زندگی سے فرار کی راہ سکھاتا ہے۔ یہ قوم زندگی کی توانائیوں سے بہرہ یاب ہونے کی بجائے موت کی سرد وافسردگی سے ہمکنار ہونے میں لذت محسوس کرتی ہے

خوش نماید زشت را آئینہ اش

در جگر صد نشتر از نوشینہ اش

اس کا آئینۂ فکر ہر برائی کو بھلائی بنا کر دکھاتا ہے۔ اس کے شہدِ سخن کا اثر یہ ہوتا ہے کہ بجائے اس کے کہ انسان کے سینے کے زخموں کو مندمل کرے، الٹا جگر میں سینکڑوں ناسور پیدا کر دیتا ہے۔

بوسۂ او تازگی از گل برد ذوق پرواز از دل بلبل برد

اگر وہ بدقسمتی سے کسی شگفتہ و شاداب پھول کا منہ چوم لے تو وہ افسردہ و پژمردہ ہو جائے۔ اس کی آواز بلبل کے کان تک پہنچ جائے تو اس کے دل سے اڑنے کی آرزو ہی مٹ جائے۔

سست اعصاب تو از افیون او
زندگانی قیمتِ مضمون او

اس کے شعر و پیام کی افیون قوائے عملیہ کو یکسر معطل کر دیتی ہے۔ وہ تمہیں مضامین تو عطا کرتا ہے لیکن ان کی قیمت میں تم سے زندگی جیسی متاع بے بہا لے لیتا ہے۔ ان سے تمہارے رگ وپے میں موت کا زہر سرایت کر دیتا ہے۔

می رباید ذوقِ رعنائی ز سرو
جرّہ شاہیں از دمِ سردش تذرو

وہ اگر سرو کی طرف دیکھے تو اس کے دل سے رعنائی و زیبائی کا ذوق ختم ہو جائے اس کی سرد آہوں سے عقاب جیسا تند و تیز صاحب بال و پر چکور بن کر رہ جائے۔ اس کی تعلیم مجاہدین کو پاشکستہ راہبین بنا دے۔

ماہی و از سینہ تا سر آدم است | چوں بنات آشیاں اندر یم است
ازنوا بر ناخدا افسوں زند | کشتیش در قعر دریا افگند

ملاحوں کی توہم پرستی کی رُو سے، سمندر میں تین پریاں رہتی ہیں (جنہیں عربی میں بنات البحر اور انگریزی میں (SIRENS) کہتے ہیں) ان کا آدھا دھڑ مچھلی کا اور آدھا انسان کا ہوتا ہے۔ جہاز ان کی خوش آوازی کے سحر سے بے راہ ہو کر غرق ہو جاتے ہیں۔ اس قسم کے شاعر کو بس بنات البحر سمجھئے۔

نغمہ ہائش از دلت دزدد ثبات
مرگ را از سحر او دانی حیات

کے خواب آور نغمات شیریں، تیرے دل سے ثبات و استحکام کی تمام قوتیں چرا کر لے جاتے ہیں۔ اور اس کی سحر آفرینی سے نگاہوں کا زاویہ اس حد تک بدل جاتا ہے کہ انسان موت کو عین حیات سمجھنے لگ جاتا ہے۔

دایۂ ہستی ز جانِ تو برد
لعل عنابی ز کانِ تو برد

وہ تیرے دل سے زندہ رہنے کی آرزو سلب کر لیتا ہے۔ وہ تیری کان (معدن) سے لعل بدخشانی نکال لیجاتا ہے اور اس طرح تجھے پیکر آب و گل سے زیادہ کچھ نہیں رہنے دیتا۔

چوں زیاں پیرایہ بندد سود را
می کند مذموم ہر محمود را

وہ اپنی پُرکاری سے ہر نقصان کو نفع بنا کر دکھاتا ہے۔ تم تباہ و برباد ہو رہے ہوتے ہو اور سمجھتے یہ ہو کہ ہم پھول پھل رہے ہیں۔ اس طرح وہ ہر قابلِ نفرت شے کو درخورِ ستائش بنا کر پیش کرتا ہے

دیریم اندیشہ اندازد ترا
از عمل بیگانہ ای سازد ترا

وہ تمہیں عمل کی دنیا سے بیگانہ بنا کر، تصورات کی افسانوی دنیا میں لے جاتا ہے جہاں تم عالمِ تفکر میں بیٹھے اس خوش فہمی میں مگن رہتے ہو کہ ہم کائنات کے لاینحل عقدوں کو حل کر رہے ہیں۔ حالانکہ کائنات کے عقدے عمل سے حل ہوتے ہیں۔ اس قسم کی فریب خوردگی سے نہیں۔

خستہ ما از کلامش خستہ تر
انجمن از دورِ جامش خستہ تر

وہ خود تباہ و برباد ہوتا ہے اور ہمیں اپنے سے بھی زیادہ تباہ و برباد کر دیتا ہے۔ وہ تنہا نہیں بھٹکتا۔ ساری کی ساری محفل کو اپنے ساتھ گمراہ کر دیتا ہے۔

جوئے برقے نیست در نیسانِ او
یک سراب رنگ و بو بستانِ او

اس کا دامنِ سحاب برق پاروں سے یکسر خالی ہوتا ہے۔ بظاہر نظر آتا ہے کہ وہ گوہر پاش ابرِ بہار ہے لیکن درحقیقت اس میں ایک قطرہ بھی سیراب کن نہیں ہوتا۔ اس کے باغ کے پھول سب کاغذی ہوتے ہیں۔ جن کا رنگ و بو حقیقی نہیں بلکہ مصنوعی ہوتا ہے۔

حسن او را با صداقت کار نیست
در بیش جز گوہرِ تفندار نیست

حسن (Beauty) اور صداقت (Truth) ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں لیکن جس چیز کو وہ حسن کہہ کر پیش کرتا ہے اسے صداقت سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ وہ یکسر ملمع و تصنع ہوتا ہے۔ اس کے بحرِ فکر میں کوئی ایک موتی بھی ایسا نہیں ہوتا جس میں عیب نہ ہو۔ اس کے جس سکے کو اٹھایئے، کھوٹا ثابت ہوتا ہے۔

خواب را خوشتر ز بیداری شمرد
آتشِ ما از نفسہائیش فسرد

اس کی تعلیم یہ ہے کہ نیند ہمیشہ بیداری سے بہتر ہوتی ہے۔ الہذا موت، زندگی سے خوش تر۔ عام قاعدہ یہ ہے کہ پھونکوں سے آگ بھڑکتی ہے لیکن اس کی پھونکوں میں ایسا نخ آلود اثر ہوتا ہے کہ ان سے رہی سہی چنگاریاں بھی خاکستر بن جاتی ہیں۔

قلب مسموم از سرودِ بلبلش　　　خفتہ مار سے زیرِ انبار گلش

اس بیل کے چھینٹوں سے (بجائے اس کے کہ دلوں میں شگفتگی پیدا ہو وہ الٹے) زہر آلود ہو جاتے ہیں۔ اس کے پھولوں کے ڈھیر کے نیچے سانپ چھپے رہتے ہیں اس لئے کسی کو ان کے قریب بھی نہیں جانا چاہیئے۔

از خم و مینا و جامش الحذر

از مئے آئینہ فامش الحذر

مختصراً یہ کہ اس کے خم اور مینا اور جام مئے سے خدا کی پناہ۔ اس کی اس شراب سے ہزار بار توبہ جو بظاہر یکسر آئینہ کی طرح شفاف نظر آتی ہے لیکن جس میں درحقیقت تلچھٹ کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

یہ ہے وہ شاعری جس نے مسلمان جیسی ہمہ تن عمل و حرارت قوم کو راکھ کا ڈھیر بنا دیا۔ اس میں نہ ایران و ہند کی کوئی تخصیص ہے نہ حافظ و عراقی میں کوئی تمیز۔ حقیقی خرابی اس کی اصل میں ہے نہ کہ برگ و بار میں۔ یہ ہمارے تصوف زدہ ماحول کی تخلیق ہے اور امت کو قرآن سے دور لے جانے کا ابلیسی حربہ۔ چنانچہ حضرت علامہ اگلے بند میں مسلمان سے یہ کہتے ہیں کہ اس شاعری نے تمہارے ساتھ کیا کیا۔؟

اس کی تفصیل کے لئے آئندہ اشاعت کا انتظار کیجئے۔

مادۂ تاریخ وفات

علامہ حافظ محمد اسلم جیراجپوری

جناب صدر الدین صاحب مکان ۶۵ کوچہ ۶۵ لینگے روڈ۔ رام نگر لاہور۔ نے حضرت علامہ مرحوم کا مندرجہ ذیل مادۂ تاریخ وفات ارسال فرمایا ہے جس سے حروف ابجد کے حساب سے ۱۳۷۵ھ تاریخ نکلتی ہے۔

مادۂ تاریخ یہ ہے۔

"علامۂ جید حافظ محمد اسلم"

۱۳ ۷۵ھ

سلسلۂ اصلاح و تذکیر

قرآنی معاشرہ

باہمی تعلقات کے متعلق قرآن کی تعلیم

(از محترم عمر احمد عثمانی صاحب)

قوموں کی زندگی میں اس کے کردار کیریکٹر، اور خصائص و امتیازات کو جو اہمیت حاصل ہے وہ محتاج بیان نہیں کسی قوم کا اپنا کردار اور کیریکٹر ہی ہوتا ہے جس سے وہ دوسری اقوام میں ممتاز نظر آتی ہے جب کسی قوم کا کردار ہی فنا ہو جائے تو وہ قوم تادیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس کی اپنی انفرادیت ختم ہو جاتی ہے اور وہ غیر محسوس طریقہ پر دوسری اقوام میں جذب ہوتی چلی جاتی ہے۔

تاریخ کے اوراق پلٹئے اور برعظیم پاک و ہند میں بسنے والے مسلمانوں کی ایک صدی پہلے کی حالت کا جائزہ لیجئے۔ اور پھر اس حالت کا آج کی حالت سے موازنہ کیجئے۔ یہ صحیح ہے کہ وہ سلطنت و حکومت سے محروم ہو کر انگریز کی غلامی میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ جہالت اور تاریکی ان پر غالب تھی ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی کے بعد وہ ہر جگہ انگریزی مظالم کا شکار تھے۔ نہ ان کی جانیں محفوظ تھیں نہ عزت و آبرو۔ اس تحریک کی ناکامی سے مایوسیوں نے ان پر غلبہ پا لیا تھا۔ لیکن بایں ہمہ، ہم دیکھتے ہیں کہ اس معاشرہ میں اوپر کے مخصوص طبقہ کو چھوڑ کر مجموعی طور پر عوام کی اخلاقی حالت ایک خصوصیت ضرور رکھتی تھی۔ اس خصوصیت کا اثر تھا کہ ہم اپنے بچپن کے زمانہ تک ہندوؤں کی زبان سے یہ سنا کرتے تھے کہ دیکھئے صاحب! یہ مسلمان ہو کر بھی جھوٹ بولتا ہے! یعنی اس زمانہ کے افراد نے اپنے کردار سے اس حقیقت کو بطور مسلمہ کے پیش کر دیا تھا کہ مسلمان جھوٹ نہیں بولا کرتے۔ اسی طرح، انفرادی، اخلاق کے دوسرے شعبوں میں بھی مسلمانوں نے اپنی خصوصیات کو ایک بڑی حد تک قائم رکھا تھا۔

آج ہم آئینی طور پر انگریز کی غلامی سے آزاد ہو چکے ہیں اور سلطنت خداداد پاکستان کے آزاد شہری ہیں۔ ایک صدی پہلے کے مقابلہ میں علم و فن میں بھی ہم نے کافی ترقی کی ہے۔ تنگ نظری اور جہالت کے جال سے اگرچہ ہم پوری طرح پر نہیں نکل سکے لیکن بلاشبہ اب سے سو سال پہلے کے مقابلہ میں ہماری حالت بدرجہا بہتر ہے مایوسی کی جگہ امیدیں ہیں۔ ناکامیابی کی جگہ کامیابیاں ہیں زرعی طور پر ہماری حالت پہلے سے بہت بہتر ہے۔ صنعتی میدان میں بھی ہم نے رقابل ذکر سہی۔ لیکن بہر حال، نمایاں ترقی

کی ہے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ایک چیز کمی ہیں ہر جگہ نظر آتی ہے اور وہ کردار اور کیریکٹر کا فقدان ہے۔ برعظیم ہند و پاک کے مسلمانوں ہی میں نہیں بلکہ پورے عالمِ اسلام میں ہر جگہ مسلمانوں کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ خود غرضی، چالاکی، فریب، جھوٹ، تن پروری ہمارے وہ خصائص ہیں جو ہم سب میں مابہ الاشتراک ہیں۔ اس میں نہ مسٹر کی قید ہے نہ مُلّا کی۔ نہ کالج کی نہ مدرسہ کی، نہ کرسیِ قیادت کی، نہ سجادۂ خانقاہ کی۔ بدقسمتی سے اس حمام میں سب ننگے ہیں۔

انیسویں اور بیسویں صدی علمی اور فنی لحاظ سے بڑی اہم صدیاں ہیں۔ جدید تحقیقات و اختراعات اور نت نئے انکشافات و تجربات نے بہت سی ان پرانی اقدار کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا ہے جن پر قوموں کے کردار اور کیرکٹر کی بنیاد ہوتی ہے۔ یورپ اس باب میں خوش نصیب تھا کہ اسے بروقت ایسے راہنما مل گئے جو پرانی اقدار کے فنا ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی قوموں کو نئی اقدار دیتے چلے گئے اس لئے یورپ کی اقوام کو پرانی بنیادوں کی جگہ وہ نئی بنیادیں ملتی چلی گئیں جن پر ان کے کردار اور کیرکٹر کی تعمیر ہوتی رہی۔ مگر مشرق اس باب میں نہایت مفلس ثابت ہوا۔ جدید و قدیم کے اس تصادم نے جہاں پرانی اقدار کی بنیادیں ہلا دیں وہاں ان کو کوئی نئی بنیادیں مہیا نہ کی جا سکیں۔ ان میں کچھ ہمارا یا ہمارے قومی راہنماؤں کا قصور بھی نہیں تھا۔ وہ علمی اور ذہنی اعتبار سے ابھی تک اس مقام تک نہیں پہنچ سکے تھے جہاں پہنچ کر جرأت رہنمائی کے ساتھ انسان خود آگے قدم بڑھاتا اور اپنے لئے اپنی نئی دنیا خود تعمیر کرتا ہے۔ ان کے سامنے اپنے ہاں کی قدیم اقدار تھیں جو گلستانِ سعدی یا اخلاقِ جلالی وغیرہ پر مبنی تھیں یا پھر یورپ کی وہ جدید اقدار تھیں جو سائنٹفک تحقیقات یا مادیت پرستی نے اس کو مہیا کی تھیں۔ علمی تحقیقات اور نئی تجربات کے اس ریلے کے سامنے پرانی اقدار تا دیر قائم نہیں رہ سکتی تھیں۔ چنانچہ نہیں رہ سکیں اور جدید اقدار کو مشرق اس لئے نہیں اپنا سکا کہ وہ اس کی طبیعت اور مزاج کے خلاف تھیں۔ مشرق کی طبیعت اور مزاج میں مذہب کا خمیر ہزار ہا سال سے یوں رچا بسا چلا آ رہا ہے کہ اسے اس سے الگ کیا ہی نہیں جا سکتا۔

ان پرانی اقدار پر جو ہمیں سعدی، رومی اور تفتازانی سے وراثت میں ملی تھیں۔ ہمارا ایمان اس لئے باقی نہ رہ سکا کہ علم و تجربہ نے ان کی غلطیاں ہم پر واضح کر دی تھیں اور جدید اقدار پر ہم اس لئے ایمان نہ لا سکے کہ ان میں ہمیں کھلا ہوا شرک اور بے دینی نظر آ رہی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم کردار اور کیرکٹر کے لحاظ سے بالکل ہی دیوالیہ ہو کر رہ گئے۔

رہنمایانِ قوم کا فرض تھا کہ وہ وقت کی اس ضرورت کو بروقت محسوس کرتے اور جو پرانی بنیادیں ختم ہوتی جا رہی تھیں ان کی جگہ قوم کو نئی بنیادیں مہیا کرتے جاتے۔ خدا کی زندہ کتاب (قرآن کریم) ان کے پاس موجود تھی جو ہر سفرِ حیات میں ہمارے لئے دلیلِ راہ بن سکتی ہے۔ مگر شاید ابھی اس کا وقت ہی نہیں آیا تھا کہ ہم اپنی ہر راہ نمائی کے لئے قرآن کی طرف رجوع کر سکیں۔

طلوعِ اسلام کو یہ سعادت نصیب ہوئی کہ اس نے یہ آواز اٹھائی کہ ہمیں اپنی مشکلات کے حل کے لئے خدا کی اس زندہ کتاب کی طرف رجوع کرنا چاہیئے جس پر خود رسول اللہ صلعم اور آپ کے صحابہ نے عمل کر کے دنیا میں وہ بلند مقام حاصل کر لیا تھا کہ آج تک کوئی قوم اس مقام تک نہیں پہنچ سکی۔ خدا نے اس کی آواز میں برکت عطا فرمائی اور ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ اب آہستہ آہستہ وہ طبقہ بھی جو لفظی طور پر اس کی مخالفت کو "جہادِ عظیم" سمجھ رہا ہے، معنوی طور پر اس کا ہم نوا ہوتا چلا جا رہا ہے اور اس نے بھی قرآن کا نام لینا شروع

کردیا ہے اس سے توقع بندھتی ہے کہ وہ دن دور نہیں جب یہ لوگ مِل کر قرآن کے ساتھ آجائیں اور واعتصموا بحبل اللہ جمیعا کا پیکر بن جائیں۔

۰ ۰ ۰ ۰ ۰ ۰

حالیہ اشاعت سے طلوعِ اسلام میں "قرآنی معاشرہ" کے عنوان سے ایک سلسلۂ مضامین شروع کیا جارہا ہے جس میں بتایا جائے گا کہ قرآن کریم مسلمانوں کا کس قسم کا معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس میں ایک فرد کا دوسرے فرد کے ساتھ اور مسلم قوم کا دوسری اقوام کے ساتھ کس قسم کا تعلق ہونا چاہیئے۔ قرآن کریم کی یہ وہ معاشرتی ہدایات ہیں جو ہمارے قومی کردار اور انفرادی کیریکٹر کی صحیح تعمیر کرسکتی ہیں۔ یہ وہ اقدار ہیں جو یقینی اور اٹل ہیں۔ ان کی بنیادوں پر جو کیریکٹر اور کردار تعمیر ہوگا وہ یقیناً دنیا کے بڑے سے بڑے انقلاب کا مقابلہ کرسکے گا اور بڑے سے بڑے تغیرات بھی اس کی بنیادوں کو متزلزل نہیں کرسکیں گے۔

معاشرہ میں سب سے پہلا تعلق وہ تعلق ہے جو اولاد کو اپنے ماں باپ کے ساتھ ہوتا ہے اس لئے سب سے پہلے ہم معاشرہ کی اس شق کو لیتے ہیں۔

والدین

اولاد کا اپنے والدین کے ساتھ نہایت گہرا تعلق ہوتا ہے وہی اس کی تولید کا ذریعہ بنتے ہیں۔ اولاد کا بچپن ایسا ہوتا ہے کہ اسے قدم قدم پر والدین کے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ماں باپ ہی ہوتے ہیں جو اس کا ہاتھ پکڑ کر چلتے اور اسے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا اور چلنا سکھاتے ہیں۔ پھر اس کی تعلیم و تربیت کا وقت آجاتا ہے تو وہ حسبِ مقدور اس فریضہ کو بھی ادا کرتے ہیں اور بچہ کو اس قابل بنا دیتے ہیں کہ وہ سوسائٹی میں اپنا مقام حاصل کرلے اور صحیح معنوں میں اپنے پیروں پر کھڑا ہو کر سفرِ زندگی شروع کرسکے۔

والدین کے ساتھ حسنِ سلوک

لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ اولاد جوں جوں بڑی ہوتی جاتی ہے۔ والدین کی عمر انحطاط پذیر ہوتی جاتی اور ان کے قوائے عمل مضمحل ہوتے جاتے ہیں۔ ان کی صلاحیتیں پژمردہ اور ان کی قوتوں میں کوتاہی آتی جاتی ہے۔ جیسا کہ کل اولاد کو اس کی ضرورت تھی کہ والدین اسے سہارا دیں ایسے ہی آج والدین کو اس کی ضرورت ہے کہ ان کی اولاد انہیں سہارا دے۔ اس مقام پر غور کیجئے کہ حیوان اور انسان میں فرق کیا ہے؟ حیوانات بھی اپنے بچوں کی پرورش اسی جذب و انہماک سے کرتے ہیں جس سے انسان اپنے بچوں کی پرورش کرتا ہے۔ گویا اولاد کی پرورش کا جذبہ حیوان اور انسان دونوں میں مشترک ہے اور جبلت کا تقاضا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اس پر زور دینے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی کہ ماں باپ کو چاہیئے کہ اولاد کی پرورش کیا کریں۔ لیکن حیوانات میں اولاد کا کوئی تعلق ماں باپ کے ساتھ باقی نہیں رہتا اس لئے وہ بڑھاپے کے زمانے میں ماں باپ کے کسی کام نہیں آتی۔ گویا ماں باپ کے کام آنا حیوانی جبلت کا تقاضا نہیں۔ اس لئے قرآن کو ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ اولاد سے تاکید کرے کہ وہ ماں باپ کی ضعیفی کے زمانہ میں ان سے حسنِ سلوک سے پیش آئیں اس سے انسانی معاشرہ میں توازن قائم رہ سکتا ہے چنانچہ ارشاد ہے،

واعبدوا اللہ ولا تشرکوا بہ شیئا وبالوالدین احسانا ...... (۴/۳۶)

خدا ہی کی اطاعت وفرماں پذیری اختیار کرو اور اس کی اطاعت میں اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔ اور والدین کے ساتھ احسان کا برتاؤ کرو۔

وحی خداوندی کی یہ ہدایت ہمارے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہے۔ اقوام گذشتہ کو بھی اسی قسم کی ہدایات دیجاتی رہی ہیں۔

واذ اخذنا میثاق بنی اسرائیل لا تعبدون الا اللہ وبالوالدین احسانا۔ (۲/۸۳)

اور یاد کرو جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا تھا کہ تم خدا کے سوا کسی کی اطاعت وفرماں پذیری اختیار نہیں کروگے اور والدین کے ساتھ احسان کا برتاؤ کروگے۔

اتنا ہی نہیں بلکہ وحی الٰہی کا یہ حتمی فیصلہ ہے جس میں کبھی تبدیلی نہیں ہوسکتی کہ انسان کو ہمیشہ اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک ہی کے ساتھ پیش آنا چاہیئے۔

وقضی ربک الا تعبدوا الا ایاہ وبالوالدین احسانا ...... (۱۷/۲۳)

تیرے پروردگار نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی ہستی کی اطاعت اور فرماں پذیری اختیار نہ کرو اور اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک کرتے رہو۔

ووصینا الانسان بوالدیہ حسنا ...... (۲۹/۸)

اور ہم نے انسان کو اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنے کا حکم دیا ہے۔

مندرجہ بالا تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا کہ قرآن کریم نے والدین کے ساتھ حسن سلوک کو کس قدر اہمیت دی ہے کہ توحید الوہیت کے بعد دوسرا حکم یہی دیا گیا ہے کہ والدین کے ساتھ "احسان" کیا جائے۔ احسان کے معنی یہی نہیں ہیں کہ روپیہ پیسہ سے ان کی مدد کردی جائے بلکہ احسان کے معنے یہ ہیں کہ جتنی جتنی کمی ان میں آتی جارہی ہے اس کو تم اپنی محنت سے پورا کرتے جاؤ تاکہ ان کی زندگی غیر متوازن نہ رہ جائے۔ اس کا حسن ختم نہ ہو جائے۔ ان کی زندگی آخر تک توازن بدوش رہے کیونکہ احسان نام ہے حسن پیدا کرنے کا اور تناسب کے بغیر حسن کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔

والدین کی اطاعت؟

یہ موضوع ذرا نازک سا ہے۔ اسے اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے۔ قرآن کی رو سے اطاعت کی دو قسمیں ہیں۔ سمجھنے کے لئے ایک کو اطاعت مطلق اور دوسری کو اطاعت مقید کہہ لیجئے۔ اطاعت مطلق تو یہ ہے کہ کسی کی فرماں برداری غیر مشروط کی جائے اس اطاعت اور فرماں برداری کو قرآن عبادت کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔ یہ اطاعت قوانین خداوندی کے سوا کسی اور کی نہیں کی جاسکتی۔ حتیٰ کہ رسولوں کو بھی یہ حق نہیں کہ وہ انسانوں سے اس قسم کی اپنی اطاعت کرا سکیں۔ محولہ بالا آیات میں بھی آپ دیکھ چکے ہیں کہ اس قسم کی اطاعت کو خدا کے ساتھ مخصوص کیا گیا ہے اور صرف کے ساتھ

حکم دیا گیا ہے کہ اس قسم کی اطاعت خدا کے سوا کسی اور کی نہ کی جائے۔ اگر اس قسم کی اطاعت میں کسی دوسری ہستی کو شریک کیا جائے تو وہ قرآن کی میزان میں شرک ہے۔ اطاعت کی دوسری قسم یعنی مقید اطاعت یہ ہے کہ خدا نے اپنی وحی کے ذریعہ سے انسانوں کے لئے جو حدود (Boundry Lines) مقرر کر دی ہیں ان کے اندر رہتے ہوئے کسی کی اطاعت کی جائے۔ اس قسم کی اطاعت کا حکم رسول اور اولی الامر (مرکز ملت اور ارکان حکومت) کے لئے دیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے

قل اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم............ (۴/۵۹)

اے پیغمبر اسلام کہہ دو کہ خدا کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو۔ اور ان ارباب حکومت کی اطاعت کرو جو تم میں سے ہوں۔

جہاں تک اس دوسری قسم کی اطاعت یعنی مقید اطاعت کا تعلق ہے تو یہ حقیقت ہے کہ قرآن کریم نے صراحت کے ساتھ والدین کے لئے اس قسم کی اطاعت کا کہیں اس طرح حکم نہیں دیا جیسا کہ رسول اور ارباب حکومت کی اطاعت کا صراحۃً حکم دیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن نے اس باب میں ایک ایسی روش کو تجویز کیا ہے جس کی مثال دنیائے مذاہب و اخلاق میں کہیں نہیں ملتی۔ دنیا کے کسی ضابطہ اخلاق کو دیکھئے۔ ہر جگہ یہی لکھا ملے گا کہ ماں باپ کی اطاعت فرض ہے۔ لیکن قرآن میں ایسا کہیں لکھا نہیں ملے گا۔ بات یہ ہے بھی بالکل واضح۔ قرآن اس کی صراحت کرتا ہے (اور تجربہ اس کی تائید) کہ انسان جوں جوں انحطاط کی عمر میں پہنچتا ہے اس کی عقل میں کمی آتی جاتی ہے اور (قرآن کے الفاظ میں) جو کچھ اس نے پہلے سیکھا ہوتا ہے وہ بھی بھولتا جاتا ہے۔ اب آپ خیال کیجئے کہ قرآن کبھی اس کا حکم دے سکتا ہے کہ ایک انسان جس کے قوائے ذہنی عروج پذیر ہیں، جو نئے نئے تجربات حاصل کرتا ہے جو دن بدن آگے بڑھتا ہے اس انسان کے فیصلوں کے تابع چلے جس کی عقل اوندھی ہو چکی ہے جو اس سے پچاس برس پیچھے کے زمانہ کا ہے جس کا علم پرانا ہو چکا ہے۔ قرآن کبھی ایسا حکم نہیں دے سکتا۔

اس میں شبہ نہیں کہ جب تک ایک بچہ، بچپن کے زمانہ سے گزرتا اور سن شعور تک نہیں پہنچتا، وہ اپنے ماں باپ کے فیصلوں کا محتاج ہوتا ہے۔ اس عمر میں اسے یقیناً ان کے کہنے کے مطابق چلنا چاہیئے۔ لیکن اس زمانے میں بھی اگر وہ کوئی ایسی بات کہیں جو احکام خداوندی کے خلاف جاتی ہو تو اسے اس سے انکار کر دینا چاہیئے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن اس باب میں حضرت ابراہیمؑ کے مسلک کو بطور اسوہ پیش کرتا ہے۔ جنہوں نے اپنے باپ سے برملا کہہ دیا ہے کہ میں تمہارے بتوں کی پرستش نہیں کر سکتا۔ وہ مہاتما رام چندر کی روش کو بطور نمونہ پیش نہیں کرتا جنہوں نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ باپ محض اپنی بیوی کی پاسداری سے ایک غلط حکم دے رہا ہے اس حکم کی تعمیل میں بن باس قبول کر لیا)۔ اسی لئے اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ اگر والدین کسی بات کا حکم دیں جو خدا کے حکم کے خلاف ہو تو ان کی اطاعت نہیں کرنی چاہیئے

خدا کے حکم کے مقابلہ میں والدین کی اطاعت نہیں کی جا سکتی

ووصینا الانسان بوالدیہ حسناً و ان جاھداک لتشرک بی ما لیس

لک بہ علم فلا تطعھما ...... (۲۹/۸)

ہم نے انسان کو اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک کی وصیت فرمائی ہے۔ لیکن اگر وہ تم سے اس کی کوشش کرنے لگیں کہ تم میرے ساتھ کسی ایسی ہستی کو شریک کرو جس کا تمہیں کوئی علم نہیں ہے تو پھر ان کی اطاعت نہ کرو۔

محولہ بالا آیت سے واضح ہوگیا کہ اگر والدین اس قسم کے حکم دینے لگیں جو خدا کی مقرر کردہ حدود سے متجاوز ہوں تو وہاں ان کی فرماں برداری ختم ہو جاتی ہے ایسے امور میں خدا کے احکام کی بجا آوری ضروری ہوگی اور والدین سے صاف کہدینا ہوگا کہ ہم ان معاملات میں آپ کے احکام کی تعمیل سے قطعاً قاصر ہوں۔ البتہ یہ مناسب نہیں ہوگا کہ اس کے بعد ہم ان سے حسن سلوک سے پیش نہ آئیں۔ چنانچہ دوسری جگہ اس کو صاف کردیا گیا ہے جہاں فرمایا:

وان جاھدٰک علٰی ان تشرک بی ما لیس لک بہ علم فلا تطعھما وصاحبھما فی الدنیا معروفا واتبع سبیل من اناب الی ...... (۳۱/۱۵)

اگر ماں باپ تم سے یہ کوشش کرنے لگیں کہ تم میرے ساتھ ان ہستیوں کو شریک ٹھہراؤ جن کا تمہیں کوئی علم نہیں ہے تو ان کی اطاعت نہ کرو مگر دنیا میں ان کے ساتھ وہی برتاؤ قائم رکھو جو جانا پہچانا اور معروف ہو اور ان لوگوں کی راہ کی پیروی کرو جو میرے قوانین کی طرف ہمہ تن متوجہ رہتے ہیں۔

لہٰذا دوسرے معاملات میں وہی جانا پہچانا برتاؤ کرتے رہنا چاہیئے جو ایک شریف معاشرہ میں اولاد اپنے ماں باپ کے ساتھ کرتی ہے۔

دوسروں کی حق تلفی کیلئے والدین کی اطاعت نہیں کیجا سکتی

ایسے ہی اگر والدین ایسے احکام دینے لگیں جن سے دوسرے اہل حقوق کی حق تلفی ہوتی ہو اور عدل و انصاف کے تقاضوں کا خون ہوتا ہو تو وہاں بھی والدین کے احکام کی اطاعت نہیں کی جا سکتی۔ عموماً دیکھا جاتا ہے کہ گھر میں ساس بہو، نندوں اور بھاوجوں اور دیورانی اور جٹھانی کی نہیں بنتی۔ ان صورتوں میں ساس اور خسر ایسا رویہ اختیار کر لیتے ہیں کہ اس سے بہو کی حق تلفی بلکہ بسا اوقات، اس پر ظلم ہونے لگتا ہے ماں باپ کی عموماً یہ خواہش بھی ہوتی ہے کہ اولاد بھی ان کی اس روش کا ساتھ دے اور اس ظلم میں وہ بھی ان کے ساتھ شریک ہو۔ قرآن کی ہدایت ایسے معاملات میں یہ ہے کہ ایک مومن کو معاشرہ میں عدل و انصاف کو قائم کرنے والا ہونا چاہیئے۔ اسے سمجھنا چاہیئے کہ وہ عدل و انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے ایک نگران کی حیثیت رکھتا ہے اس میں خواہ اسے خود اپنی مرضی اور والدین اور اعزاء و اقرباء کی مرضی کو قربان ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ اس کا فرض ہے کہ وہ عدل و انصاف کی میزان کو ہمیشہ اپنے سامنے رکھے اور اس کی ہدایت کے مطابق عمل پیرا رہے۔

یا ایھا الذین اٰمنوا کونوا قوامین بالقسط شھداء للہ ولو علٰی انفسکم او الوالدین والاقربین (۴/۱۳۵)

اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! عدل و انصاف کو قائم کرنے والے اور خدا کے لئے نگراں بن کر رہو خواہ اس قیام اور نگرانی کی زد خود تمہارے اپنے والدین اور اقرباء کے خلاف ہی کیوں نہ پڑتی ہو۔

لہٰذا ایک مؤمن کو عدل و انصاف کی میزان سے کر ہمیشہ یہ دیکھتے رہنا ہوگا کہ والدین کے حقوق کیا ہیں اور بیوی بچوں کے حقوق کیا ہیں۔ اور ان حقوق کے درمیان ایسا نظم و ضبط اور توازن قائم رکھنا چاہیئے کہ کسی ایک کی وجہ سے دوسروں کی حق تلفی نہ ہوتی ہو۔

بے عقلی کی باتوں میں والدین کی اطاعت نہیں کی جا سکتی

جیسا کہ پہلے اجمالاً کہا جا چکا ہے والدین جب سن رسیدہ ہو جاتے ہیں تو بعض اوقات وہ ایسی بے عقلی کی باتیں کرنے لگتے ہیں جو ایک صاحب عقل و ہوش آدمی نہیں کر سکتا وہ ایسے ایسے بے تکے احکام صادر کرنے لگتے ہیں جو سراسر خلاف مصلحت ہوتے ہیں اور بعض اوقات اولاد کے مستقبل کو تیرہ و تار کر ڈالتے ہیں۔ وہ ان کی زندگی کو گوناگوں مشکلات و مصائب کی آماجگاہ بنا کر اسے اجیرن کر دیتے ہیں۔ اولاد جب سن رشد کو پہنچ جائے اور اپنے برے بھلے کو خود سمجھنے لگے تو اسے محض اس وجہ سے کہ وہ اس کے والدین کے احکام ہیں جانتے بوجھتے ایسے احکام کی پیروی نہیں کرنی چاہیئے۔ ہمیں یہ حقیقت اپنے سامنے رکھنی چاہیئے کہ سن رسیدہ ہو جانے کی وجہ سے جہاں ان کے دیگر قوائے عملیہ انحطاط پذیر ہو جاتے ہیں۔ وہیں ان کے قوائے عقلیہ بھی بڑی حد تک مضمحل ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا ایسے معاملات میں انسان کو خود عقل و ہوش سے کام لے کر قدم اٹھانا چاہیئے۔ قرآن کریم نے اس حقیقت کو بڑے خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے۔

وَمَن نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ ۖ أَفَلَا يَعْقِلُونَ ○ (۳۶/۶۸)

اور ہم جن لوگوں کی عمر لمبی کر دیتے ہیں، پیدائشی طور پر ہم انہیں بالکل اوندھا کر دیتے ہیں۔ کیا یہ لوگ اتنا بھی نہیں سمجھتے۔

عمر جوں جوں بڑھتی جاتی ہے انسان پیدائشی طور پر اوندھا ہوتا جاتا ہے۔ وہ بڑھاپے میں بالکل بچوں جیسی باتیں کرنے لگتا ہے یعنی وہ عقل سے کم کام لیتا ہے اور جذبات سے زیادہ۔ لہٰذا انسان کو اپنے معاملات کے فیصلے عقل و ہوش کی روشنی میں کرنے چاہئیں۔ والدین کے متعلق یہ حقیقت اچھی طرح ذہن نشین رکھنی چاہیئے کہ اب ان کے انحطاط کا زمانہ آ گیا ہے۔ لہٰذا ضروری نہیں کہ جو کچھ وہ کہتے ہوں وہ عقل و شعور کا بھی تقاضا ہو۔ ان کی باتیں سنو اور عقل و شعور کی میزان میں ان کا وزن کرو۔ اگر ان کی ہدایات تقاضائے عقل کے مطابق ہوں تو خیر۔ ورنہ سمجھ لو کہ یہ بیچارے معذور ہو چکے ہیں۔

والدین سے حسن سلوک اور کشادہ ظرفی کے سلسلہ میں قرآن نے حضرات انبیاء کرام کی مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ چنانچہ حضرت یحییٰ کے تذکرہ کے ضمن میں ہے

وَبَرًّا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُن جَبَّارًا عَصِيًّا ○ (۱۹/۱۴)

وہ اپنے والدین کے ساتھ بھلائی کا سلوک کرنے والے تھے اور سرکش نہیں تھے۔

حضرت عیسیٰ کے متعلق فرمایا کہ انہوں نے اعلان کیا کہ

وَبَرًّا بِوَالِدَتِي وَلَمْ يَجْعَلْنِي جَبَّارًا شَقِيًّا ٥ (۱۹/۳۲)

خدا نے مجھے اپنی والدہ کے ساتھ اچھا سلوک کرنے والا بنایا ہے اور مجھے
جبار اور بدبخت یا سنگدل نہیں بنایا۔

شکر انسان کے ہر عمل کا ایک مقصد اور نتیجہ ہوتا ہے۔ ماں باپ سالہا سال تک بچہ کی پرورش اور تعلیم و تربیت کے سلسلہ میں جو مصائب جھیلتے رہتے ہیں۔ ان کا بھی کوئی مقصد اور نتیجہ ہونا چاہیئے اس کے کچھ تقاضے ہونے چاہئیں۔ اس کی وجہ سے بچہ پر کچھ ذمہ داریاں عائد ہونی چاہئیں۔ اولاد کا فرض ہے کہ وہ ماں باپ کی ان کوششوں اور مساعی کے بھرپور نتائج پیش کرے۔ قرآن والدین کے لئے شکر کا حکم دیتا ہے مگر شکر کے معنی یہ نہیں کہ زبان سے شکریہ ادا کرکے اولاد سبکدوش ہو جائے بلکہ شکریہ کے معنی ہیں پورے پورے نتائج مہیا کرنا ان جائز آرزوؤں اور تمناؤں کی تکمیل کرنا جن کے ماتحت اس کے ماں باپ ان مشکلات و مصائب کو جھیلتے آئے ہیں ان کی اس سعی و عمل کی قدرشناسی کرنا جو انہوں نے اس کی صحیح تعلیم و تربیت کے سلسلہ میں کی ہے یعنی صحیح معنوں میں وہ کچھ بن جانا جو ایسی تعلیم و تربیت کا مقصد ہو۔

وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلَىٰ
وَهْنٍ وَفِصَالُهُ فِي عَامَيْنِ أَنِ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ
إِلَيَّ الْمَصِيرُ ٥ (۳۱/۱۴)

ہم نے انسان کو اس کے والدین کے متعلق بھی حکم دیا ہے۔ جیسے ماں باوجودیکہ ضعیف پر ضعیف ہوتی جاتی ہوتی ہے مگر وہ اس کے حمل کی دشواریوں کو برداشت کرتی اور پھر دو سال تک دودھ پلانے کے بعد اس کا دودھ چھڑاتی ہے کہ وہ ہمارے انعامات اور والدین کے احسانات کی پوری پوری قدرشناسی کرے کیونکہ بہرحال انجام کے لحاظ سے ہمارے قانون ہی کی طرف ہر چیز کو لوٹنا ہوگا۔

اپنی محنت کے ماحصل کو والدین کیلئے کھلا چھوڑ دینا ضروری ہے اسلامی معاشرہ میں سرمایہ اندوزی تو جائز ہی نہیں۔ ہر مسلمان کا فریضہ ہے کہ وہ اپنی محنت کے ماحصل کو کھلا رکھے اور جہاں ضرورت دیکھے وہاں اس کو صرف کر دے۔ کیونکہ اسلامی معاشرہ میں انسان اپنی محنت کے ماحصل کا مالک نہیں ہوتا بلکہ اس کا امین ہوتا ہے۔ اسے اس میں سے اپنے لئے اتنا ہی لینے کی اجازت ہے جتنی کی اسے ضرورت ہو۔ اور اس کے بعد جتنا کچھ اس کی ضرورت سے بچ جائے وہ ان لوگوں کا حق ہے جو اپنی ضروریات کے مطابق حاصل نہیں کر سکتے مگر ان لوگوں میں سب سے مقدم ترین حق والدین کا ہے۔ قرآن کریم نے جہاں ان لوگوں کا تذکرہ فرمایا ہے جن کے لئے ہمیں اپنی محنتوں کے ماحصل کو کھلا رکھنا چاہیئے۔ ان میں سب سے پہلے والدین ہی کو رکھا گیا ہے۔

يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۔ قُلْ مَا اَنْفَقْتُمْ مِنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسَاكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۔ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ (۲/۲۱۵)

اے پیغمبر اسلام! لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کتنا کچھ مفاد عامہ کے لئے کھلا چھوڑ دیں۔ آپ ان سے کہدیجئے کہ جو اموال تم کو مفاد عامہ کے لئے کھلے رکھنے چاہئیں وہ والدین، قریبی رشتہ دار، یتامیٰ، مساکین، اور مسافروں کے لئے ہیں۔ اور جو کچھ بھلائی تم کرتے ہو تو خدا اسے بخوبی جانتا ہے۔

قرآن کریم کی اس آیت نے جہاں یہ بتا دیا کہ کن کن لوگوں کے لئے ہمیں اپنے محنت کے ماحصل کو کھلا رکھنا چاہیئے اور ان کی ترتیب کیا ہونی چاہیئے وہیں اس طرف بھی اشارہ کر دیا ہے کہ یہ تو بتایا جا سکتا ہے کہ تمہیں کن کن مدوں پر خرچ کرنا ہوگا مگر اسے متعین کر کے نہیں بتایا جا سکتا کہ کتنا کچھ خرچ کرنا ہوگا۔ کیونکہ اس کا مدار حالات پر ہے جو بدلتے رہتے ہیں۔

والدین کے ساتھ سخت کلامی کرنا جائز نہیں

بعض مرتبہ والدین اس عقلی انحطاط کو پہنچ جاتے ہیں کہ وہ بے تکی باتیں کرنے لگتے ہیں کہ ان باتوں پر غصہ آ جانا چاہیئے۔ مگر اولاد کیلئے یہ زیبا نہیں کہ وہ اپنے جذبات پر کنٹرول نہ رکھے اور آپے سے باہر ہو جائے۔ اسے یہ چیز ہمیشہ مدنظر رکھنی چاہیئے کہ وہ اپنی کبرسنی کی وجہ سے اس مرحلہ پر پہنچ چکے ہیں جہاں پہنچ کر وہ معذور ہو جاتے ہیں۔ وہ جو کچھ بے عقلی کی باتیں کرتے ہیں عمداً نہیں کرتے۔ وہ اپنے نزدیک اسی کو عقل کا تقاضا سمجھ رہے ہوتے ہیں۔ لہذا نرمی اور بلا طعنت کے ساتھ انہیں سمجھا دینا چاہیئے اور عزت و احترام کے ساتھ ان سے گفتگو کرنی چاہیئے۔

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۔ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَا اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَا اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا (۱۷/۲۳)

اور تیرے نشوونما دینے والے نے یہ حکم دیا کہ تم اس کے سوا کسی کی بھی اطاعت و فرماں پذیری اختیار نہ کرو۔ اور والدین کے ساتھ ہمیشہ حسن سلوک کے ساتھ پیش آؤ۔ اگر ان میں سے کوئی ایک یا دونوں بڑی عمر کو پہنچ جائیں اور بڑھاپے کی وجہ سے بے عقلی کی باتیں کرنے لگیں، تو ان کو برا بھلا نہ کہو اور نہ ہی ان کو جھڑکو۔ بلکہ ان سے عزت و احترام کے ساتھ گفتگو کرو۔

والدین کے ساتھ ہمیشہ فروتنی سے پیش آؤ

ان کے ساتھ نرمی سے پیش آنا چاہیئے اور اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ ایک زمانہ ہم پر بھی ایسا گزرا ہے جبکہ ہم میں عقل و شعور نہیں تھا۔ اور اسی قسم کی بے عقلی کی باتیں ہم بھی کیا کرتے تھے۔ مگر ان والدین نے ان بے عقلی کی باتوں پر ہمیں ڈانٹا ڈپٹا نہیں تھا بلکہ ہمارے بچپن میں اس قسم کی بے عقلی کی باتوں پر وہ ہنسکر خاموش ہو جایا کرتے تھے بلکہ بعض وقعہ اپنے خوش ہوتے تھے۔ اب، اگر ہمارے والدین کبرسنی کی وجہ سے اس قسم کی بچوں جیسی باتیں کرنے لگے ہیں تو ہمیں اس پر ڈانٹ ڈپٹ نہیں کرنی چاہیئے کہ یہ معذور ہیں۔ اور معذور پر غصہ کیسا!

واخفض لهما جناح الذل من الرحمة وقل رب ارحمهما کما ربیانی صغیرا ۥ (۱۷/۲۴)

اور رحمت کے تقاضے کے مطابق انکسار اور فروتنی کا پہلو ان کے لئے ہمیشہ جھکائے رکھنا چاہیئے اور کہنا چاہیئے کہ اے پروردگار ان دونوں پر رحم فرما جیسا کہ ان دونوں نے مجھے اس وقت پروان چڑھایا تھا جبکہ میں بہت چھوٹا تھا۔

لیکن غلط روش زندگی پر والدین کو تنبیہہ ضرور کر دینی چاہیئے

لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ تم والدین کو کچھ کہو ہی نہیں اور ان کے سامنے ہر وقت بھیگی بلی بنے رہو۔ سخت کلامی۔ توہین اور جھڑکنا جائز نہیں ہے۔ لیکن اگر تم دیکھ رہے ہو کہ ان کی روش زندگی غلط خطوط پر جا رہی ہے اور خدا نے تمہیں صحیح رستہ دکھا دیا ہے تو تمہارا یہ بھی فریضہ ہے کہ تم ان کو ان کی غلط روش زندگی پر مناسب طریقہ سے ٹوک دو اور انہیں بتا دو کہ ان کی یہ روش صحیح نہیں ہے۔ اس روش کو انہیں چھوڑ دینا چاہیئے۔ اور اس کے بجائے صحیح روش زندگی اختیار کرنی چاہیئے۔

وَإِذْ قَالَ إِبْرٰهِيمُ لِأَبِيهِ آزَرَ أَتَتَّخِذُ أَصْنَامًا آلِهَةً ۚ إِنِّي أَرٰىكَ وَقَوْمَكَ فِي ضَلٰلٍ مُّبِينٍ ۥ (۶/۷۵)

اور یاد کرو جب ابراہیم نے اپنے باپ آذر سے کہا تھا کہ کیا تم ان بتوں کو اپنا الٰہ بنا رہے ہو۔ اگر ایسا ہے تو میں تمہیں اور تمہاری پوری قوم کو کھلی گمراہی میں دیکھ رہا ہوں۔

بلکہ اگر تصادم کی نوبت پہنچ جائے اور تمہیں نظر آ رہا ہو کہ تمہارے والدین خود تمہیں بھی صحیح روش زندگی پر چلنے نہیں دیتے اور تمہارے راستہ میں حائل ہوتے ہیں تو ایسی صورت میں ان سے کنارہ کش ہو جانا چاہیئے۔

اذ قال لابیہ یابت لم تعبد ما لا یسمع ولا یبصر ولا یغنی عنک شیئا ۥ یابت انی قد جاءنی من العلم ما لم یاتک فاتبعنی اھدک صراطا سویا ۥ یابت لا تعبد الشیطن ۥ ان الشیطن کان للرحمن عصیا ۥ یابت انی اخاف ان یمسک عذاب من الرحمن فتکون للشیطن ولیا ۥ قال اراغب انت عن الھتی یابرھیم ۚ لئن لم تنتہ لارجمنک واھجرنی ملیا ۥ قال سلم علیک ساستغفر لک ربی انہ کان بی حفیا ۥ واعتزلکم وما تدعون من دون اللہ وادعو ربی ۔ عسی ان لا اکون بدعاء ربی شقیا ۥ (۱۹/۴۲ - ۴۸)

یاد کرو جب ابراہیم نے اپنے باپ سے کہا تھا۔ ابا جان! آپ ان چیزوں کی پرستش کیوں کرتے

ہیں جو سنتی ہیں، نہ دیکھتی ہیں اور نہ آپ کو کوئی فائدہ پہنچا سکتی ہیں۔ اباجان! مجھے علم و بصیرت کی وہ دولت مل گئی ہے جو آپ کو نہیں ملی۔ آپ میرا اتباع کیجئے، میں آپ کو سیدھے اور صحیح راستہ کی رہنمائی کر دوں گا۔ اباجان شیطان کی اطاعت نہ کیجئے۔ شیطان تو حقیقتاً خدا کا بڑا ہی نافرمان ہے۔ اباجان مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں خدا کی طرف سے آپ کو کوئی تکلیف نہ پہنچ جائے اور اس طرح آپ شیطان کے دوست نہ بن جائیں (یہ باتیں سن کر) باپ نے کہا۔ اے ابراہیم! کیا تم میرے معبودوں سے روگردانی کر رہے ہو؟ دیکھو، اگر تم باز نہ آئے تو میں تمہیں سنگسار کر دوں گا۔ کچھ عرصہ کے لئے تم مجھے چھوڑ دو (میں دیکھتا ہوں کہ اس عرصہ میں تم اپنی روش ٹھیک کر لیتے ہو یا نہیں) ابراہیم نے کہا کہ اباجان میں آپ کے لئے سلامتی ہی کی آرزوئیں رکھتا ہوں اور اپنے پروردگار سے تمہارے لئے سامانِ حفاظت ہی مانگتا رہوں گا۔ میرا پروردگار مجھ پر بہت ہی مہربان ہے۔ اور میں تم لوگوں سے اور ان معبودانِ باطل سے کنارہ کش ہو جاؤں گا جنہیں تم خدا کے سوا پکارتے ہو۔ میں تو اپنے پروردگار ہی کو پکارتا رہوں گا۔ یقیناً اپنے پروردگار کو پکارنے سے (زندگی کی کامرانیوں سے محروم) نہیں رہ سکوں گا۔

لیکن اس کنارہ کشی کے ساتھ ساتھ ان کے لئے نیک آرزوئیں ضرور باقی رہنی چاہئیں۔ آپ نے محولہ بالا آیات میں دیکھ لیا ہوگا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے والد سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہوئے بھی

سَلٰمٌ عَلَيْكَ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ

میں آپ کے لئے اس کے باوجود بھی سلامتی کی آرزوئیں رکھتا ہوں اور اپنے پروردگار سے آپ کے لئے سامانِ حفاظت ہی کا طلبگار رہوں گا۔

فرماتے ہیں۔ لہٰذا کنارہ کش ہو جانے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم ان کے بدخواہ اور دشمن بن جائیں۔ ہمیں ان کی گمراہیوں پر رنج اور افسوس ہونا چاہیئے اور یہ خواہش ہمیشہ رکھنی چاہیئے کہ کاش وہ راہ راست پر آجاتے۔ ان کی گمراہی پر ہمارا دل کڑھنا چاہیئے اور ایک خیرخواہ کی طرح ان کے لئے نیک خواہشات اپنے دل میں رکھنی چاہئیں۔

اس مضمون کو قرآن کریم نے دوسری جگہ مزید وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے جہاں فرمایا۔

قد كانت لكم اسوة حسنة فى ابراهيم والذين معه اذ قالوا لقومهم انا برءؤا منكم ومما تعبدون من دون الله۔ كفرنا بكم وبدا بيننا وبينكم العداوة والبغضاء ابدا حتى تؤمنوا بالله وحده الا قول ابراهيم لابيه لاستغفرن لك وما املك

لك من اللہ من شیء .... (پ۲۸)

اے پیروان دعوت ایمانی! تم لوگوں کے لئے ابراہیم اور اس کے ساتھیوں کی زندگی میں پیروی کے لئے اچھا نمونہ ہے جب انھوں نے اپنی قوم سے صاف صاف کہدیا کہ ہم تم سے اور ان ہستیوں سے جن کی تم خدا کے سوا اطاعت اور فرماں پذیری اختیار کئے ہوئے ہو بالکل بری ہیں۔ ہم اس روش زندگی کا انکار کرتے ہیں۔ ہمارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ کے لئے عداوت اور بغض کا تعلق واضح ہوگیا ہے اور یہ تعلق اس وقت تک باقی رہے گا جب تک تم تنہا اللہ پر ایمان نہ لے آؤ۔ البتہ ابراہیم نے اپنے باپ سے یہ ضرور کہا تھا کہ میں تیرے لئے سامان حفاظت کا طلبگار ضرور رہوں گا لیکن خدا کی طرف سے تیرے لئے کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتا۔

اس آیت میں قرآن کریم نے اس چیلنج کا ذکر کیا ہے جو حضرت ابراہیم اور ان کے ساتھیوں نے اپنی قوم کو دیا ہے۔ چیلنج کے الفاظ پر غور فرمایئے کتنا واضح اور کتنا صاف چیلنج ہے صرف برأت اور قطع تعلق ہی کا اعلان نہیں بلکہ ساتھ ہی ساتھ نفرت اور عداوت کا بھی اعلان ہے مگر اس کے باوجود حضرت ابراہیم اپنے والد سے پھر بھی اپنی ان نیک خواہشات کا اظہار کرتے ہیں کہ میں تمہارے لئے سامان حفاظت کا طلبگار ضرور رہوں گا۔ اگرچہ جو بات تمہیں قانون خداوندی کی رو سے پیش آجائے تو مجھے اس کی قطعاً قدرت نہیں ہے کہ میں اس کو روک دوں لیکن میں اپنے دل میں تمہارے لئے نیک آرزوئیں ضرور رکھوں گا۔ چنانچہ یہ نیک آرزوئیں حضرت ابراہیمؑ نے اپنے باپ کے لئے برابر رکھیں۔ اور ظاہر ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے دل میں اپنے باپ کے لئے اس سے بڑھ کر اور نیک آرزو کیا ہوسکتی تھی کہ خدائے تعالیٰ اس کو ہدایت کی توفیق عطا فرمادے۔ لیکن ایک نبی کا کام ہدایت کی کوشش اور تنسار کھنا ہوتا ہے۔ صحیح راستے پر لگا دینا نہیں ہوتا۔

انك لا تهدی من احببت ولكن الله يهدی من يشاء (پ۲۰)

جسے تم چاہو اسے تم ہدایت نہیں دے سکتے بلکہ ہدایت تو خدا کے قانون کے مطابق ہی مل سکتی ہے اور اسے ہی مل سکتی ہے جو ہدایت لینا چاہتا ہو۔

مالداروں کو مرتے وقت اپنے والدین کیلئے وصیت کرنی چاہیئے

اگر خدا نے تمہیں مال دیا ہے اور تمہاری موت کا وقت قریب آگیا ہے تو مرتے وقت بھی والدین کے حقوق کو بھولنا نہیں چاہیئے۔ اگر والدین ضرورتمند ہیں اور تمہارے مال کی انہیں ضرورت ہے تو تم پر واجب ہے کہ ان کے لئے اور دیگر رشتہ داروں کے لئے مناسب وصیت کر جاؤ تاکہ تمہارے بعد ان کی مٹی خراب نہ ہو اور وہ تمہاری اس وصیت سے اپنی زندگی کے باقی دن آسانی سے پورے کرسکیں

كتب عليكم اذا حضر احدكم الموت ان ترك خيرا ن الوصية للوالدين والاقربين بالمعروف۔ حقا على المتقين ○ (پ۲)

جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت قریب آجائے تو اگر وہ مال چھوڑ کر مر رہا ہو تو تم پر یہ واجب ٹھہرا دیا گیا ہے کہ اپنے والدین اور اقربا کے لئے معروف طریقہ پر وصیت کر جاؤ۔ یہ چیز ان لوگوں پر واجب ہے جو اپنی زندگی کو خدا کے قوانین سے ہم آہنگ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

لہٰذا صرف اتنا ہی ضروری نہیں کہ زندگی بھر تم اپنے والدین کی خدمت کرتے رہو اور ان کے حقوق ادا کرتے رہو۔ بلکہ اگر خدا نے تمہیں توفیق اور وسعت دی ہے تو مرتے وقت بھی ان کو فراموش نہ کرو۔ نہ صرف ان کو بلکہ ان کے ساتھ دوسرے ضرورتمند اعزا و اقربا کو بھی یاد رکھو اور جتنا مناسب معلوم ہو ان کے لئے وصیت کر دو۔

یہاں دو باتوں کو ضمناً جان لینا ضروری ہے۔ ایک تو یہ کہ قرآن نے تقسیم وراثت کے جو قوانین مقرر کئے ہیں، وہ مرنے والے کی وصیت کو پورا کرنے کے بعد ہی نافذ العمل ہوں گے۔ قرآن کی رو سے مرنے والے کو پورا پورا حق حاصل ہے کہ وہ اپنے ترکہ کی جس طرح مناسب سمجھے تقسیم کی وصیت کر جائے۔ دوسرے یہ کہ انفاق اور ورثہ وغیرہ کے احکام اس دور سے متعلق ہیں جب ہنوز قرآنی نظام معیشت قائم نہ ہوا ہو۔ اس نظام میں ان احکام کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔

البتہ نتائج اعمال میں تم والدین کے کام نہیں آسکتے

مگر اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ والدین کا حسن سلوک ہمارے ساتھ اور ہمارا حسن سلوک والدین کے ساتھ صرف دنیوی معاملات تک ہی محدود رہ سکتا ہے۔ جہاں تک نتائج اعمال کا تعلق ہے نہ ماں باپ اپنی اولاد کے کام آسکتے ہیں اور نہ اولاد اپنے ماں باپ کے کچھ کام آسکتی ہے۔ نتائج اعمال پر مرتب ہوتے ہیں اور وہ ویسے ہی ہوں گے جیسے ہمارے اپنے اعمال ہوں گے۔ اگر ہم نے صلاحیت بخش کام کئے ہیں تو ان کے عمدہ نتائج ہمیں حاصل ہوں گے اور اگر ہم نے غیر صلاحیت بخش کام کئے ہیں تو ان کے بُرے نتائج کو بھی ہمیں بھگتنا پڑے گا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم غیر صلاحیت بخش کام کرتے رہے ہیں لیکن چونکہ ہمارے ماں باپ صلاحیت بخش کام کرتے رہے ہیں اسلئے ان کے اعمال کے نتائج سے ہمیں کچھ حصہ مل جائے۔ یا ہمارے ماں باپ غیر صلاحیت بخش کام کرتے رہے ہیں تو ہمارے صلاحیت بخش اعمال میں ان کو کچھ حصہ مل جائے۔

يا ايها الناس اتقوا ربكم واخشوا يوما لا يجزى والد عن ولده
ولا مولود هو جاز عن والده شيئا ۚ ان وعد الله حق فلا تغرنكم
الحيوة الدنيا ولا يغرنكم بالله الغرور (۳۱/۳۳)

اے افرادِ نسل انسانی! اپنے اعمال کو خداوندی قوانین سے ہم آہنگ رکھو اور اس دن سے ڈرتے رہو جبکہ نہ باپ اپنے بیٹے کے کام آسکے گا اور نہ بیٹا کچھ اپنے باپ کے کام آسکے گا۔ یاد رکھو خدا کا یہ وعدہ حقیقت پر مبنی ہے لہٰذا تمہیں دنیوی زندگی سے دھوکہ نہیں کھانا چاہیئے اور خدا کے قوانین کے متعلق کسی فریب میں نہیں رہنا چاہیئے۔

یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ جس طرح دنیوی زندگی میں باپ اپنی اولاد کے کام آجاتا ہے اور اولاد اپنے باپ کے کام آجاتی ہے ایسے ہی دوسری زندگی میں بھی جہاں اپنے اپنے اعمال کے مطابق ہر شخص کو نتائج کا سامنا کرنا ہوگا کوئی ایک دوسرے کے کام آسکے گا۔

ماں باپ کے مرجانے کے بعد جو کھانے پکا پکا کر خیرات کئے جاتے ہیں یا فاتحہ دلوائی جاتی ہے یا قرآن پڑھ پڑھ کر بخشے جاتے ہیں یا حج بدل کا ثواب پہنچایا جاتا ہے ان کا کوئی فائدہ مرنے والوں کو نہیں پہنچتا۔ فائدہ صرف ان اعمال کا پہنچتا ہے جو کسی نے خود کئے ہوں۔

ہمیں والدین پر کئے گئے انعامات کا بھی احسان مند ہونا چاہیئے

اولاد کا تعلق اپنے ماں باپ کے ساتھ کچھ اس قسم کا ہے کہ اولاد اپنے ماں باپ کے مال سے بھی استفادہ کرتی ہے، ان کے علم اور تجربے سے بھی فائدہ اٹھاتی ہے، ان کی صلاحیتوں سے بھی مستفید ہوتی ہے۔ غرضیکہ ان کی ہر چیز سے استفادہ کرتی ہے۔ لہٰذا جو انعامات ہمارے والدین پر کئے جاتے ہیں بالواسطہ وہ ہم پر بھی ہوتے ہیں اس لئے ہمیں ان انعامات کا بھی احسان مند ہونا چاہیئے جو اگرچہ ہم پر براہ راست نہیں کئے گئے ہیں۔ لیکن ہم نے ان سے حصہ لیا ہے اور استفادہ کیا ہے لہٰذا جن انعامات خداوندی سے ہمارے والدین بہرہ یاب ہوئے تھے۔ ہمیں ان کا بھی شکر گزار ہونا چاہیئے کہ اگر یہ چیزیں نہ ہوتیں تو ہمارے والدین کما حقہ ہماری صلاحیتوں کو اُجاگر کرنے کے قابل نہ ہوسکتے۔ اس لئے وہ انعامات ہمارے والدین ہی پر نہیں ہیں بلکہ خود ہم پر بھی ہیں۔

ووصینا الانسان بوالدیہ احسانا حملتہ امہ کرھا ووضعتہ کرھا وحملہ وفصالہ ثلثون شھرا حتی اذا بلغ اشدہ وبلغ اربعین سنۃ قال رب اوزعنی ان اشکر نعمتک التی انعمت علی وعلی والدی وان اعمل صالحا ترضاہ واصلح لی فی ذریتی انی تبت الیک وانی من المسلمین اولئک الذین نتقبل عنھم احسن ...... ما عملوا ونتجاوز عن سیاتھم فی اصحاب الجنۃ ۔ وعد الصدق الذی کانوا یوعدون ○ (۴۶ / ۱۵—۱۶)

ہم نے انسان کو اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس کی ماں تکلیف کے ساتھ اسے پیٹ میں اٹھائے رہی ہے اور تکلیف کے ساتھ ہی وضع حمل کے مرحلوں سے گزرتی ہے۔ پورے تیس مہینوں تک حمل اور دودھ پلانے کا سلسلہ قائم رہتا ہے حتیٰ کہ جب آدمی اپنی پوری توانائی کو پہنچ جاتا ہے اور چالیس سال کا ہو جاتا ہے اور بارگاہِ الٰہی میں یوں تمنا پرداز ہوتا ہے کہ اے میرے پرورش کرنے والے! مجھے اس کی توفیق دے کہ میں تیری ان نعمتوں کے بھرپور نتائج پیدا کروں جو تو نے خود مجھ پر کی ہیں اور ان نعمتوں کے بھی جو تو نے میرے والدین پر فرمائی ہیں اور مجھے توفیق دے کہ میں وہ صلاحیت بخش کام کروں جنہیں تو پسند کرتا ہے اور میری اولاد میں بھی صلاحیت بخشی کی استعداد عطا فرما۔

میں تیری ہی طرف رجوع ہوتا ہوں۔ اور میں تیرے فرمانبرداروں میں سے ہوں۔ یہ ہیں وہ لوگ جن کے توازن بدوش اعمال ہم قبول کر لیتے ہیں اور غیر توازن بدوش اعمال سے درگزر کر دیتے ہیں۔ ان کا شمار جنتی معاشرہ والوں میں ہوتا ہے۔ یہ خدا کا سچا وعدہ ہے جو ہمیشہ نوع انسانی سے کیا جاتا رہا ہے۔

والدین کی خدمت

اولاد کو چاہیئے کہ وہ والدین کی جتنی ہو سکتی ہو خدمت بجا لائے گھر کے کام کاج میں ان کا ہاتھ بٹائے۔ اور اگر والدین کام کاج کرنے کے قابل نہ رہے ہوں تو گھر کا کام کاج خود کرے۔ قرآن کریم نے حضرت شعیب علیہ السلام کی دو صاحبزادیوں کا اس طرح ذکر کیا ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر سے بھاگ کر مدین تشریف لائے تو

وَوَجَدَ مِنْ دُونِهِمُ امْرَأَتَيْنِ تَذُودَانِ ۖ قَالَ مَا خَطْبُكُمَا ۖ قَالَتَا لَا نَسْقِي حَتَّىٰ يُصْدِرَ الرِّعَاءُ ۖ وَأَبُونَا شَيْخٌ كَبِيرٌ ۝ (۲۸/۲۳)

موسیٰ نے دیکھا کہ لوگوں کے پیچھے دو عورتیں کھڑی ہیں جو اپنے جانوروں کو پانی سے روک رہی ہیں۔ موسیٰ نے پوچھا کہ تمہیں کیا ہوا (تم جانوروں کو پانی کیوں نہیں پلاتیں ان کو کیوں روک رہی ہو) ان دونوں نے جواب دیا کہ ہم اس وقت تک پانی نہیں پلا سکتے جب تک چرواہے پانی پلا کر اپنے جانوروں کو واپس نہ لیجائیں۔ کیونکہ ہمارا باپ بہت ہی بوڑھا آدمی ہے۔

آپ نے دیکھا کہ قرآن نے ان مختصر سے الفاظ میں کتنی بڑی حقیقت کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ باپ بہت ہی بوڑھا آدمی ہے اس لئے دونوں لڑکیاں خود جانوروں کو پانی پلانے آئی ہیں۔ عورت کمزور ہوتی ہے اس لئے اسے ایسی سرزمین بے آئین میں جہاں کا قانون (Might is Right) کے مطابق جس کی لاٹھی اس کی بھینس پر عمل پیرا ہو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ طاقتوروں سے پہلے اپنے جانوروں کو پانی پلانے کی جرأت کر سکے۔ جانور تو بہرحال جانور ہیں وہ اس حقیقت کو تو نہیں سمجھتے۔ پانی ان کے سامنے آتا ہے تو وہ پیاس کی وجہ سے پانی کی طرف بڑھنے کے لئے زور لگاتے ہیں اور یہ دونوں ناتوان لڑکیاں اپنے جانوروں کو پانی کی طرف بڑھنے سے روک رہی ہیں۔ یہ تھا وہ نقشہ جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہاں دیکھا۔ یہ نقشہ کچھ قوم شعیبؑ کے ساتھ ہی مخصوص نہیں تھا۔ آج بھی ہر جگہ جہاں حدود الٰہی کے مطابق زندگی بسر نہ ہوتی ہو آپ بعینہٖ یہی نقشہ پائیں گے۔ اس حقیقت سے صرف نظر کرکے آپ یہاں صرف اتنا دیکھئے کہ حضرت شعیب علیہ السلام چونکہ کافی بوڑھے ہو چکے تھے اور اس قابل نہیں تھے کہ اپنے جانوروں کو خود لیجا کر گھاٹ پر پانی پلا سکیں اس لئے آپ کی صاحبزادیاں یہ کام انجام دے رہی ہیں۔ اس لئے اس مثال کو سامنے رکھتے ہوئے اولاد کا یہ فریضہ ہے کہ گھر کی ضروریات پورا کرنے کے لئے اگر والدین اس قابل نہ رہے ہوں کہ وہ کوئی کام کر سکیں تو اولاد کو یہ کام خود کرنے چاہئیں اس میں لڑکوں اور لڑکیوں کی کوئی قید نہیں ہے۔ اگر کسی کے ہاں نرینہ اولاد نہ ہو تو لڑکیوں کو بھی یہ فریضہ انجام دینا چاہیئے

والدین کا احترام

ماں باپ قابل احترام ہستیاں ہیں اس لئے ان کے ساتھ ہمیشہ عزت و احترام کے ساتھ ہی پیش آنا چاہیئے ان کو معزز جگہ پر بٹھاؤ۔ اپنے سے اونچا نہیں تو کم از کم انہیں اپنے سے نیچا بھی نہ رکھو۔ اگر تم انھیں اپنے سے بہتر کھلا پلا نہیں سکتے تو کم از کم جیسا خود کھاتے پہنتے ہو ویسا ہی ان کو بھی کھلاؤ اور پہناؤ۔ قرآن کریم نے حضرت یعقوب اور ان کے کنبہ کی مصر میں تشریف آوری کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

فلما دخلوا علی یوسف اوی الیہ ابویہ وقال ادخلوا مصر ان شاء اللہ امنین ورفع ابویہ علے العرش........ (۱۲ — ۹۹ — ۱۰۰)

جب یہ لوگ مصر میں داخل ہوئے تو یوسف نے اپنے والدین کو اپنے پاس جگہ دی اور ان سے کہا کہ آپ لوگ انشاءاللہ مصر میں امن وامان کے ساتھ داخل ہوں۔ اور یوسف نے اپنے والدین کو اپنے پاس تخت پر بٹھایا۔

عزت واحترام یہی نہیں کہ ماں باپ تمہارے پاس آئیں تو تم انہیں عزت واحترام کی جگہ پر بٹھا دو۔ بلکہ تمام معاملات میں ان کے ساتھ یہی سلوک کرنا چاہیئے خوراک۔ لباس، رہنے سہنے، غرضکہ تمام باتوں میں اس عزت واحترام کو ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ یہ نہیں کہ ماں باپ کو اس طرح رکھا جائے جیسے نوکروں کو رکھا جاتا ہے ان کو اس طرح کھلایا پلایا جائے جیسے نوکروں کو کھلایا پلایا جاتا ہے۔ یہ چیز قطعاً غلط ہے اور منشائے خداوندی کے خلاف ہے۔

یہ ہے اس تعلق کی صورت جو قرآنی معاشرہ میں ماں باپ کے ساتھ ان کی اولاد کی ہونی چاہیئے۔ مندرجہ بالا تصریحات سے ہمارے سامنے وہ تمام حدود آگئی ہیں جو قرآن نے اس سلسلہ میں قائم کی ہیں۔ ہمیں ان حدود کے اندر نہایت احتیاط کے ساتھ متوازن زندگی بسر کرنی چاہیئے۔ افراط اور تفریط کا قطعاً شکار نہ ہونا چاہیئے۔ قرآن کا کمال یہی ہے کہ اس کی تعلیمات میں نہ افراط ہے اور نہ تفریط۔ راگنی کوی آئیدہ

انسان نے کیا سوچا؟

از پرویز

قیمت ——— دس روپے

اسلام کی سرگزشت

(گزشتہ قسط میں اس امر سے بحث کی جا رہی تھی کہ :-

اسلامی فتوحات کے زیر اثر بین الاقوامی اختلاط سے مسلمانوں کی عقلی اور دینی زندگی پر کیا نتائج مرتب ہوئے اور مسلمانوں کی زندگی کے کن کن شعبوں کو انھوں نے متاثر کیا۔ یہ بحث ہنوز جاری ہے۔

ممالک مفتوحہ کا اسلام میں داخلہ

اسباب اختلاط میں سے دوسرا بڑا سبب یہ تھا کہ ممالک مفتوحہ کی کثیر تعداد اسلام میں داخل ہو گئی تھی۔ اور وہ عربوں کے ساتھ اس طرح گھل مل گئے تھے کہ عرب معلوم ہونے لگتے تھے۔ بلاذری کی فتوح البلدان میں ہے کہ خسرو پرویز نے دیلم کے علاقہ کی طرف آدمی بھیجکر چار ہزار آدمی منگائے تھے۔ جو اس کے خاص خادم اور مقربین میں سے شمار ہوتے تھے۔ آخر تک ان کا یہی مرتبہ رہا۔ رستم کے ساتھ یہ لوگ قادسیہ کے مقام پر شریک جنگ ہوئے جب رستم مارا گیا۔ اور ایرانی فوج کو شکست ہو گئی۔ تو وہ آپس میں کہنے لگے کہ ہمارا حال ان ایرانیوں کی طرح تو ہے نہیں۔ ہمارا تو یہاں کوئی ٹھکانا بھی نہیں ہے۔ ان لوگوں کے ساتھ ہمارا برتاؤ بھی کچھ اچھا نہیں رہا۔ ہماری رائے تو یہ ہے کہ ہم مسلمانوں کے ساتھ ان کے مذہب میں شامل ہو جائیں۔ اور اس طرح عزت حاصل کر لیں۔ چنانچہ یہ لوگ ایرانیوں سے الگ ہو گئے۔ حضرت سعدؓ کو جب اس کی اطلاع ہوئی۔ تو انھوں نے تحقیق حال کے لئے حضرت مغیرہ ابن شعبہؓ کو ان کے پاس بھیجا۔ انھوں نے ان سے پوچھ گچھ کر کے حضرت سعدؓ کو آکر اس کی اطلاع دی۔ چنانچہ حضرت سعدؓ نے ان کو امان دیدی۔ اور وہ مسلمان ہو گئے۔ اور فتح مدائن اور فتح جلولاء میں یہ لوگ حضرت سعدؓ کے ساتھ ہو کر شریک جنگ ہوئے۔ پھر وہاں سے واپس ہوئے۔ اور کوفہ میں مسلمانوں کے ساتھ آکر بس گئے[1]۔ اس قسم کی اور بھی بہت سی مثالیں ہیں۔

لوگوں کے اسلام میں داخل ہونے کے مختلف اسباب ہوتے تھے۔ کچھ لوگ تو نیک نیتی اور سچائی کے ساتھ اسلام میں داخل ہوتے تھے۔ کیونکہ اسلامی عقائد کی سادگی، اور ان کا سہل الفہم ہونا ان کے دلوں کو اپیل کرتا تھا۔ کچھ لوگ محض جزیہ سے بچنے کے لئے اسلام لے آتے تھے۔ کیونکہ انھیں معلوم تھا کہ جو لوگ اپنے پرانے مذہب پر قائم رہیں گے۔ ان پر جزیہ لگا دیا جائے گا لیکن جو

---

[1] فتوح البلدان ص ۲۸۰ طبع یورپ۔

لوگ مسلمان ہو جائیں گے۔ ان سے جزیہ معاف کر دیا جائے گا۔ جزیہ سے بچنے کی خاطر جو لوگ مسلمان ہو جاتے تھے۔ ان کی ہولناک کثرت نے بعض گورنروں کو تشویش میں ڈال دیا تھا۔ چنانچہ حجاج ابن یوسف کے عاملوں نے حجاج کو لکھا کہ خراج کا نظام درہم برہم ہوا جا رہا ہے۔ ذمی لوگ دھڑا دھڑ مسلمان ہوتے جا رہے اور شہروں میں آکر بستے جا رہے ہیں۔ اس پر حجاج نے ایسے لوگوں سے مسلمان ہو جانے کے باوجود جزیہ وصول کیا۔ چنانچہ بصرہ کے قراء اس زیادتی پر آٹھ آٹھ آنسو روتے تھے[1]۔ بعض لوگ ظلم و تعدی سے بچنے کے لئے اسلام میں داخل ہوتے تھے۔ کیونکہ اسلام ارباب حکومت کا دین تھا۔ اس دین کے ساتھ جس کی نسبت ہوتی تھی وہ معزز سمجھا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ دوسرے مذاہب حلقہ ہائے حکومت میں ناپسندیدہ اور مکروہ سمجھے جاتے تھے۔ اگرچہ کسی شخص کو اپنے دینی شعائر کی ادائیگی سے روکا نہیں جاتا تھا۔ بلکہ انہیں اس کی پوری آزادی حاصل تھی۔ ان وجوہات میں اتنا اضافہ اور کر لیجیئے، کہ انفرادی طور پر کچھ حکام ایسے بھی تھے جو ذمیوں کے بارے میں اسلام کی تعلیمات اور حضرت عمر کے احکام پر پوری طرح عمل نہیں کرتے تھے۔ بلکہ ان کو بری طرح ستاتے تھے۔ لوگ اس وجہ سے بھی اپنے مذہبوں کو چھوڑ کر اسلام میں داخل ہونے پر مجبور ہو جاتے تھے۔

سکونت میں اختلاط

امتزاج و اختلاط کا تیسرا بڑا سبب سکونتی مقامات میں اختلاط تھا۔ فتوحات کے بعد جو شہر مفتوح ہوئے۔ وہ فاتحین اور مفتوحین دونوں کا یکساں مسکن ہے۔ حرکت اجتماعیہ اور اقتصادیہ میں عربوں اور غیر عربوں دونوں نے برابر کا حصہ لیا۔ ولہوسن (WELLHAUSEN) کا بیان ہے کہ کوفہ کی نصف سے زیادہ آبادی موالی و آزاد کردہ غلاموں پر مشتمل تھی۔ یہ موالی مختلف پیشے، حرفے اور تجارت کرتے تھے۔ ان میں زیادہ تر لوگ اپنی جنس اور زبان کے اعتبار سے ایرانی تھے۔ یہ لوگ کوفہ میں ایران جنگ کی صورت میں آئے۔ اس کے بعد مسلمان ہو گئے۔ اور ان کے مالکوں یعنی عربوں نے انہیں آزاد کر دیا۔ چنانچہ یہ عربوں کے موالی یعنی آزاد کردہ غلام تھے۔ اس طرح وہ آزاد تو ہو گئے۔ مگر اس کے بعد بھی انہیں اپنے مالکوں کی حمایت اور حفاظت کی ضرورت تھی۔ چنانچہ یہ لوگ صلح اور جنگ دونوں صورتوں میں عربوں کے حاشیہ نشین اور ان کے متبعین ہی میں شمار ہوتے تھے۔ یہی حال باقی تمام شہروں کا تھا کہ ہر شہر میں عربی عنصر اور اجنبی عنصر پوری طرح خلط ملط ہو گئے تھے۔ ایران، شام، مصر، مغرب غرضیکہ تمام ممالک میں یہی صورت تھی۔ حتیٰ کہ خود جزیرۂ عرب بھی اپنی آبادی کے اعتبار سے خالص عرب نہیں رہا تھا۔ بلکہ وہ ہر قسم کے مسلمانوں کا ایک جزیرہ بن گیا تھا۔ مدینہ منورہ جو عظیم تر فتوحات کے عہد ــــ یعنی حضرت عمرؓ کے عہد میں دارالخلافہ تھا۔ وہاں مختلف قوموں کے ایلچی اور سفیر آتے تھے۔ دیگر اقوام کے ضرورت مند لوگ حاضر ہوتے رہتے تھے۔ وہاں جنگی قیدی بھی لائے جاتے تھے۔ کیونکہ حضرت عمرؓ کی یہ ہدایات اس بارے میں فیصلہ کن حیثیت رکھتی تھیں کہ مال غنیمت اور اسیران جنگ کو مفتوحہ علاقوں میں تقسیم نہ کیا جائے۔ بلکہ دارالخلافہ میں تمام چیزیں بھیجدی جائیں۔ اور یہاں آکر وہ تقسیم کی جائیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مدینہ منورہ اور اس کے آس پاس کا علاقہ غیر عربی عناصر سے پُر ہو چکا تھا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کی شہادت کی سازش

---

[1] ابن الاثیر صفحہ ۱۶۹ جلد ۴۔

بھی ان ایرانیوں نے ہی ترتیب دی تھی۔ جو مدینہ منورہ میں سکونت پذیر تھے۔ جس کو ابو لؤلؤہ ایرانی نے عملی جامہ پہنایا تھا۔ اس پر مزید اضافہ یہ بھی کر لیجئے کہ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ دونوں ایسے شہر تھے۔ جہاں زمین کے ہر اطراف و جوانب سے حجاج اور زائرین جو اسلام میں داخل ہو چکے تھے۔ ہر سال آتے رہتے تھے۔ ان امور نے مل کر جزیرہ عرب کو تمام مسلمانوں کے درمیان ایک مقام مشترک بنا دیا تھا جہاں مختلف عناصر باہم گر مختلط ہوتے تھے۔ اور اس کی حالت بھی اس سے قطعاً مختلف نہیں رہی تھی۔ جو دیگر مفتوحہ ممالک کی تھی۔ فرق صرف اتنا ہی تھا کہ جزیرۂ عرب میں عربی عنصر کی آبادی ذرا زیادہ تھی۔ اور ممالک مفتوحہ میں غیر عربی عنصر کی آبادی زیادہ تھی۔

امتزاج و اختلاط میں ان تمام اسباب و ذرائع نے پورا پورا کام کیا۔ چنانچہ ایرانی اور رومی عادات، عربی عادات کے ساتھ مختلط ہوئیں۔ ایرانی اور رومی قانون ان احکام کے ساتھ مختلط ہوا۔ جن کو قرآن و سنت نے بیان کیا تھا۔ ایرانی حِکَمْ اور رومی فلسفہ کا عربی حِکَم کے ساتھ امتزاج ہوا۔ ایرانی اور رومی طرز حکومت کا عربی طرز حکومت کے ساتھ اختلاط ہوا۔ مختصر یہ ہے کہ زندگی اور نظم سیاسی و اجتماعی کے تمام گوشے۔ حتیٰ کہ طبائع عقلیہ بھی بڑی حد تک اس امتزاج سے متاثر ہوتی چلی گئیں۔

چونکہ مفتوحہ اقوام مدنیت و حضارت کے لحاظ سے زیادہ ترقی یافتہ اور نظم اجتماعی کے اعتبار سے زیادہ قوی تھیں۔ اس لئے اس کا طبعی نتیجہ یہی ہوتا تھا کہ ان کی مدنیت و حضارت اور نظم اجتماعی کی سیادت قائم ہو جائے۔ البتہ چونکہ عرب فاتح ہونے کی حیثیت سے قوی عنصر کی حیثیت رکھتے تھے۔ انھوں نے اتنا ہی کیا کہ اس نظام میں اعتدال پیدا کر کے اسے ایسا بنا لیا جائے جو ان کی عقلیت سے متفق ہو سکے۔ چنانچہ ممالک مفتوحہ میں اس نظام کی سیادت برقرار رہی جس کی پیروی فتح سے پہلے کی جاتی تھی۔ مثلاً دفتری نظام وغیرہ اسی حالت پر باقی رہا۔ جس پر وہ اب تک چلا آرہا تھا۔ حتیٰ کہ خود دفاتر کی زبان بھی عبدالملک بن مروان کے عہد تک وہی رہی جو اس علاقہ میں فتح اسلامی سے پہلے ہوتی تھی۔ ہمارا موضوع یہاں اس نظم سیاسی اور اجتماعی کو بیان کرنا نہیں ہے۔ بلکہ ہمارا موضوع حیات عقلیہ کو بیان ہے۔ مگر حیاتِ عقلیہ کی حالت بھی بعینہٖ وہی کچھ تھی جو نظم اجتماعی اور سیاسی کی تھی۔ یہ امتزاج جو عرب قوم اور دیگر اجنبی اقوام میں برپا تھا۔ ایک قسم کا عملی تخلیط تھا۔ جس کے نتائج کچھ ہی زمانہ کے بعد برآمد ہوگئے۔

ان مفتوحہ اقوام میں سے بہت سے لوگ اسلام میں داخل ہو گئے۔ ان کے اپنے علم، امثال، شعر و ادب کے ذخیرے تھے۔ ان میں سے کچھ ایسے لوگ بھی تھے۔ جن کے ہاں علوم مدون شکل میں موجود تھے۔ اور ان پر بڑی بڑی کتابیں تھیں۔ انہیں علوم کی تدوین اور بحث و تحقیق کا سلیقہ تھا۔ جب یہ لوگ اسلام پر ثابت قدم ہو گئے اور انہیں سکون و اطمینان نصیب ہوا تو انھوں نے اور ان کی اولاد نے اپنے علمی مناہج کو جن سے وہ اور ان کے آباؤ اجداد مانوس چلے آرہے تھے۔ اسلام پر منطبق کرنا شروع کر دیا۔ جس کی وضاحت ہم آگے چل کر کریں گے۔

اظہار یہ ہے کہ اسلامی عقائد بھی اس امتزاج کے اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکے۔ کیا اس کا گمان بھی کیا جاسکتا ہے کہ

ایک ایرانی، شامی، نصرانی، رومی یا قبطی جب اسلام میں داخل ہوتا ہوگا تو وہ تمام عقاید جو آبا و اجداد سے صدیوں سے ان میں وراثتاً چلے آ رہے تھے۔ یکبارگی مٹ جاتے ہوں گے۔ اور اس نے اسلام کو اسی طرح سمجھ لیا ہوگا۔ جیسا کہ اسلام اپنی تعلیمات سے اسے سمجھانا چاہتا تھا؟ ہرگز نہیں۔ اس کا امکان ہی نہیں۔ علم النفس اسے تسلیم نہیں کرتا۔ ایرانی کے ذہن میں الٰہ کا جو تصور تھا۔ وہ اس تصور سے قطعاً مختلف تھا جو ایک رومی، نصرانی کے ذہن میں ہوتا تھا۔ اور یہ دونوں تصورات اس تصور سے قطعاً جداگانہ ہوتے تھے جو ایک مصری نصرانی کے ذہن میں ہوتا تھا۔ اسی طرح وہ الفاظ جو مختلف ادیان میں مستعمل ہوتے آئے ہیں۔ جیسے جہنم، جنت، ابلیس، ملائکہ، آخرت، نبی وغیرہ۔ ان کے معنی ہر مذہبی فرقہ کے نزدیک ان معنوں سے مختلف ہوتے تھے۔ جو دوسرے دینی فرقوں کے نزدیک ان کے معنی ہوتے تھے۔ لہٰذا یہ خیال نہیں کیا جا سکتا کہ دوسری قوموں کے جو لوگ اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ انھوں نے ان الفاظ کو بالکلیہ اسی طرح سمجھ لیا تھا۔ جس طرح انھیں عربوں نے سمجھا تھا۔ حتیٰ کہ ان میں سے جو لوگ خلوص کے ساتھ اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ انھوں نے بھی اس قسم کی چیزوں کو اپنی پرانی دینی تقلیدات کے ساتھ آمیز کر کے سمجھا ہوگا۔ بلکہ قرآن کریم کے ان الفاظ کو اپنے ان الفاظ کے قریب کر کے ہی سمجھا ہوگا۔ جو خود ان کے پرانے ادیان میں مستعمل تھے۔ اس کے شواہد بکثرت موجود ہیں۔ مثلاً ازدی نے اپنی کتاب فتوح الشام میں بیان کیا ہے کہ شام کے ایک آدمی نے دوسرے آدمی سے معاہدہ کیا کہ وہ اس کی بکریاں چرایا کرے گا۔ جس کا معاوضہ یہ ہوگا کہ بکری کا مالک اپنی بیوی کو رات کے وقت اس کے پاس بھیجا کرے گا کہ وہ اس کے ساتھ شب باشی کرے۔ حضرت عمرؓ نے ان دونوں آدمیوں کو طلب کیا۔ تو ان دونوں نے یہ اقرار کر لیا کہ انھیں اس امر کے حرام ہونے کا کوئی علم ہی نہیں تھا — یا مثلاً ابن عبدربہ نے عقد الفرید میں بیان کیا ہے کہ دین کے معاملہ میں جس قدر تشدد موالی کے اندر نظر آتا تھا۔ بادیہ نشین عربوں میں اس کا عشر عشیر بھی نہیں تھا۔[1]

اسلام میں ان قوموں کے اثرات پہلی صدی ہجری کے آخر میں نظر آنے لگے تھے۔ جب کہ مختلف مذاہب کا ظہور ہونے لگا تھا۔ اسے ہم تفصیل کے ساتھ آئندہ بیان کریں گے۔ شاید یہی سبب تھا جس کی وجہ سے حضرت عمرؓ ان فتوحات کے حاصل ہونے پر خوفزدہ رہتے تھے۔ ابو حنیفہ دینوری نے اپنی کتاب "الاخبار الطوال" میں لکھا ہے کہ "جنگ جلولاء میں مسلمانوں کو اتنا مال غنیمت اور اسیران جنگ ہاتھ آئے کہ اس سے پہلے کبھی ہاتھ نہیں آئے تھے۔ اس جنگ میں شرفاء ایران کی بہت سی لڑکیاں بھی گرفتار ہو کر آئی تھیں۔ لوگوں کا بیان ہے کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ اکثر فرمایا کرتے تھے۔ خدایا میں جلولاء کی گرفتار شدہ عورتوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں — اس کے بعد وہ ان عورتوں کے بچے ہی تو تھے جو جنگ صفین میں صف آرا تھے۔" صحیح ہے انھوں نے ضرور خدا کی پناہ مانگی ہوگی۔ اور انھیں ان سے بلکہ تمام موالی اور ان کی اولاد سے پناہ مانگنا ہی چاہیے تھی۔ کیونکہ ان لوگوں کی جو سیاسی عصبیت تھی وہ عربی عصبیت سے ایک جداگانہ بلکہ مخالف عصبیت تھی۔ ان کی اپنی دینی تقلیدات تھیں۔ جن کی طرف ان کا جھکاؤ ضروری تھا۔ اور اس طرح ان کی راہ اسلام کے عربی اور سادہ رجحانات کے خلاف ہی ہو سکتی تھی۔

[1] العقد الفرید صفحہ ۹۰:۹۱ ج ۲۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ امتزاج نہایت ہی تیزی اور شدید قسم کا امتزاج تھا۔ موالی اور دیگر اجنبی اقوام کے اثرات زندگی کے ہر شعبہ میں چھائے ہوئے تھے۔ اب اجتماعی مسائل میں وہاں ویسی ہی جنگ برپا تھی جیسی اب سے پہلے فوجوں کے اجسام میں برپا ہو چکی تھی۔ لیکن مورخین نے اس جنگ کی تفاصیل بیان نہیں کیں۔ حالانکہ ان کو بیان کر دینا زیادہ ضروری تھا۔ عربی زبان اور دیگر زبانوں میں جنگ تھی۔ عربی آرزوؤں اور دوسری قوم کی آرزوؤں میں جنگ تھی۔ عرب کے سادہ نظم اجتماعی اور رومی اور ایرانی نظم اجتماعی میں جنگ تھی۔ جسمانی جنگیں اگرچہ ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کی فتوحات کے ساتھ تقریباً ختم ہو چکی تھیں لیکن یہ دوسری جنگیں اس کے بعد بھی عرصہ دراز تک قائم رہیں۔ اسلامی مملکت ان جنگوں کے لئے ایک وسیع میدان بن گیا تھا۔ جس میں مختلف آرزوئیں ایک دوسرے کے ساتھ دست و گریبان تھیں۔ ایرانی لوگ اپنی پرانی مملکت کی طرف جھکاؤ رکھتے تھے اور سمجھتے تھے کہ وہ عربوں سے زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔ رومیوں کا بھی یہی حال تھا۔ مغرب اور مصر استقلال و آزادی کے خواہاں تھے ایرانیوں کے ہاں ایک خاص نظام تھا۔ رومیوں کا ان سے الگ نظام تھا۔ رومی قانون رومی مستعمرات میں چل رہا تھا۔ اور ایرانی قانون مملکت ایران میں رائج تھا۔ اسلام جو قانون دیتا تھا۔ وہ بعض صورتوں میں ان سے موافق ہوتا تھا۔ اور بعض صورتوں میں ان کے خلاف جاتا تھا۔ ایرانیوں میں کچھ مجوسی تھے جو مجوسی ہی رہے۔ اور کچھ ان میں سے مسلمان ہو گئے۔ روم میں کچھ نصرانی تھے۔ اور کچھ لوگ ان میں سے بھی مسلمان ہو چکے تھے۔ مصر میں نصرانی لوگ تھے۔ جن میں سے کچھ لوگ مسلمان بھی ہو گئے تھے۔ ان تمام ملکوں اور شہروں میں یہودی بھی آباد تھے۔ جن میں کچھ یہودی مسلمان ہو گئے تھے۔ زبانوں میں سے اسلامی مملکت میں عربی، فارسی، قبطی، یونانی اور عبرانی سب زبانوں کا طوطی بول رہا تھا۔ یہ تمام رجحانات اور زبانیں مسلسل جنگ میں مبتلا تھیں۔ اور مملکت اسلامیہ ان کا میدان جنگ تھا۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم تک اس جنگ کی تفصیلات میں سے قدر قلیل ہی پہنچ سکا ہے۔ امت اسلامیہ اب امت عربیہ نہیں رہی تھی۔ جس کی زبان ایک، دین ایک، رجحان ایک اور خیال ایک تھا۔ جیسا کہ رسول اللہ صلعم کے عہد مبارک میں نظر آتا تھا۔ بلکہ امت اسلامیہ اب تمام امتوں کا، تمام رجحانات اور تمام زبانوں کا مجموعہ تھی۔ جو آپس میں ایک دوسرے سے برسرِپیکار تھیں۔ اس جنگ کا نتیجہ فیصلہ کن نہیں تھا۔ کبھی ایرانیوں کو فتح ہوتی تھی۔ کبھی عربوں کو فتح ہوتی تھی۔ اور کبھی رومیوں کو۔

واقعہ یہ ہے کہ اگرچہ عربوں کو نظم سیاسی اور اجتماعی اور ان کے متعلقات مثل فلسفہ اور علوم وغیرہ میں شکست فاش ہوئی۔ لیکن انہوں نے دو بڑی چیزوں میں فتح حاصل کر لی۔ یہ دو بڑی چیزیں زبان اور دین تھا۔ ان کی زبان ان تمام ممالک پر چھا گئی۔ اور اس کے مقابلہ میں ان ممالک کی اصلی زبانوں کو شکست فاش نصیب ہوئی۔ عربی زبان ہی سیاست کی زبان یعنی علم کی زبان قرار پا گئی۔ عربوں کی یہ فتحمندی زیادہ تر ان ممالک میں آج تک ان کی حلیف بنی چلی آرہی ہے۔ یہی حال دین کا ہوا کہ دین اسلام ان تمام ممالک پر چھا گیا۔ اور وہاں کی آبادیاں مسلمان ہوتی چلی گئیں ان ممالک میں بہت ہی کم لوگ ایسے باقی رہ گئے جو اپنے اصلی دین پر قائم رہے ہوں ـــــ ان دونوں عناصر یعنی زبان اور دین کی فتحمندی کے باوجود ـــــ یہ بھی ایک حقیقت واقعہ ہے کہ باہمی جنگ کے اثناء میں دین اور زبان دونوں ہی متصادم زبانوں اور ادیان سے متاثر ہو چکے تھے۔

زبان میں وہ سلیقہ ہی باقی نہیں رہا۔ اور اس میں غلطیاں عام ہو گئیں۔ حتیٰ کہ ایسے قوانین کی ضرورت پڑ گئی جو اس میں ضبط اور نظم قائم کر سکیں۔ ابو عبیدہ نے کہا ہے کہ عبداللہ بن الاتم کا گذر نوالی میں سے چند لوگوں پر ہوا جو علم نحو کا تذکرہ کر رہے تھے تو عبداللہ بن الاتم نے کہا کہ اب تم زبان کو ٹھیک کر رہے ہو۔ حالانکہ سب سے پہلے تم نے ہی اسے خراب بھی کیا تھا۔ ابو عبیدہ نے کہا کہ کاش عبداللہ ابن الاتم نے صفوان، خاقان اور موئل بن خاقان کا غلط تلفظ سنا ہوتا[1]۔ ایسے ہی عربی زبان پر بہت سے عجمی الفاظ، عجمی ترکیبیں، عجمی خیال اور عجمی مضامین غالب آتے گئے۔ بالکل یہی حالت دین کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے کہ وہ بظاہر اگرچہ نعمتمند ہو گیا تھا۔ لیکن۔ وہ دیگر ادیان سے متاثر ہونے سے نہ بچ سکا۔ اور مسلمانوں میں متعدد فرقے بن گئے۔ اور نئے نئے مذہبوں کی داغ بیل پڑ گئی۔ خود قرآن کریم کی تفسیر ابتدا، خلقت وغیرہ کے ان قصوں سے کی جانے لگی۔ جو دوسری مذہبی کتابوں میں وارد ہوئے تھے[2]۔ یہ فرقے کبھی کبھی باتوں کے ذریعہ سے جنگ کرتے تھے۔ اور کبھی کبھی سچ مچ تلواروں کے ساتھ نبرد آزما ہو جاتے تھے۔

---

[1] العقد الفرید جلد ۲۔ [2] لیکن اس تمام اختلاط و امتزاج اور تخالف و تزاحم میں ایک چیز تھی۔ جو اپنی اصلیت پر باقی رہی۔ اور وہ تھے قرآن کے الفاظ جو آج تک اپنی اصلی شکل پر باقی ہیں۔ لہٰذا آج اس دین کو جسے رسول اللہؐ نے دنیا کو دیا تھا۔ اپنے اصلی رنگ میں سمجھنے کا ایک ہی طریق اور ذریعہ ہے۔ اور وہ یہ کہ دین کا سرچشمہ خالص قرآن کو قرار دیا جائے۔ اور قرآن کو خود قرآن ہی سے سمجھا جائے۔

(طلوع اسلام)

طلوع اسلام

★ طلوع اسلام بلند پایہ علمی پرچہ ہے۔
★ پاکستان کے ہر گوشے اور ہر طبقے میں گہری دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے۔
★ پاکستان کے علاوہ دیگر ممالک میں بھی جاتا ہے۔
★ اس میں شائع شدہ اشتہارات ہزاروں خریداروں کی نظروں سے گذرتے ہیں۔
★ اس میں اشتہار دے کر اپنی تجارت کو فروغ دیجیے
★ نرخنامہ اشتہارات ناظم ادارہ شعبہ اشتہارات سے حاصل کیجیے۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام پوسٹ بکس نمبر ۳۱۳، کراچی

حقائق و عبر

۱۔ سنت خلفائے راشدین

آپ قریب آٹھ سال سے مسلسل طلوع اسلام اور جماعت اسلامی کی آویزش کا مطالعہ کرتے چلے آرہے ہیں۔ اس میں آپ نے ایک بنیادی چیز ملاحظہ کی ہوگی۔ اور وہ یہ کہ حدیث و سنت کے متعلق جماعت اسلامی والے بھی کم و بیش وہی عقائد رکھتے ہیں۔ جنہیں طلوع اسلام پیش کرتا ہے۔ لیکن جماعت اسلامی والے اپنی مصلحتوں کے مطابق رنگ بدلتے رہتے ہیں۔ اور موقعہ اور محل کے لحاظ سے مختلف باتیں کہتے رہتے ہیں۔ وہ آپ کو حامی حدیث۔ اور متبع سنت اور طلوع اسلام کو منکر حدیث مشہور کرتے ہیں۔ اور ان کی یہی وہ روش ہے۔ جس کی ہم شدت سے مخالفت کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً طلوع اسلام کا مسلک یہ ہے کہ قرآنی اصولوں کی جن جزئیات کو رسول اللہؐ نے متعین فرمایا تھا۔ اگر بعد کا اسلامی نظام یہ دیکھے کہ تغیر حالات سے ان میں کسی تبدیلی کی ضرورت ہے۔ تو وہ ایسی تبدیلی کر سکتا ہے۔ جماعت اسلامی والے اس مسلک کو انکار حدیث اور انکار سنت قرار دے کر اپنی تحریروں اور تقریروں میں طلوع اسلام کو گردن زدنی ٹھہراتے ہیں۔ لیکن جب بعینہ حرفاً حرفاً یہی کچھ ان کے امیر کہتے ہیں۔ تو ان کے خلاف ایک لفظ بھی کسی کی زبان پر نہیں آتا۔ اسی طرح جب طلوع اسلام نے یہ کہا کہ اس باب میں جو پوزیشن حضرات خلفائے راشدینؓ کی تھی۔ جب اس قسم کا اسلامی نظام پھر قائم ہوگا۔ تو اس نظام کے مرکز کی وہی حیثیت ہوگی اور اس مرکز کے فیصلے "سنت خلفائے راشدین" میں شامل ہوں گے۔ اور ان کی اتباع سنت رسول اللہ کی اتباع میں داخل ہوگی تو اس پر بھی جماعت اسلامی نے شور مچادیا کہ طلوع اسلام فتنہ پرداز ہے۔ اور عام انسانوں کو خلفائے راشدین کا ہم رتبہ بتاتا ہے۔ چنانچہ امین احسن صاحب اصلاحی نے یہاں تک لکھ دیا کہ

> آپ کو معلوم ہے کہ اللہ تعالےٰ نے ہم سے یہ مطالبہ نہیں کیا کہ ہم ابوبکر صدیق اور عمرؓ کی حکومت کی طرح ایک حکومت قائم کردیں۔ نہ بندوں کو اس بات کی طاقت حاصل ہے۔ نہ خدا نے اس کی تکلیف دی ہے۔ (چراغ راہ مئی ۱۹۵۳ء)

اب یہی امین احسن صاحب اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ خلفائے راشدین میں کون کون شامل ہیں۔ ترجمان القرآن بابت فروری ۱۹۵۶ء میں تحریر فرماتے ہیں۔

> اس حدیث میں دیکھ لیجئے۔ "سنت الخلفاء الراشدین" کے الفاظ صاف موجود ہیں۔ بلکہ راشدین

کے بعد "مہدیین" کا اضافہ بھی ہے۔ اس میں نہایت واضح الفاظ میں حضور نے اپنی سنت کے ساتھ خلفائے راشدین کی سنت کا ذکر بھی فرمایا ہے۔ اور اپنی سنت کی طرح اس پر قائم رہنے کی ہدایت بھی فرمائی ہے ۔ ۔ ۔ اس لفظ کے اندر وہ تمام خلفائے راشدین داخل ہیں۔ جو آپ کی امت کے اندر پیدا ہوئے۔ یا آئندہ پیدا ہوں گے۔ اور حکومت کے فرائض صحیح اسلامی طریق پر انجام دیں گے۔

آگے چل کر لکھتے ہیں۔

چنانچہ تاریخ کی شہادت موجود ہے کہ اس (خلافت علی منہاج نبوت) کے بعد اچھے حکمراں بھی پیدا ہوئے۔ اور برے بھی پیدا ہوئے۔ اور کوئی وجہ نہیں کہ اب یہ فیصلہ کر لیا جائے کہ آئندہ کبھی اس دنیا میں خلافت علی منہاج نبوت کا دور نہیں آئے گا۔ نہ نقل میں ہمیں کوئی چیز ایسی ملتی ہے جو اس کا دروازہ بند کرتی ہو۔ اور نہ عقلاً اس کا آنا کسی طرح محال اور مستبعد قرار دیا جا سکتا ہے۔[1]

طلوع اسلام نے بھی یہی کہا تھا کہ خلافت علی منہاج نبوت، اب بھی قائم ہو سکتی ہے۔ اور جب ایسی خلافت قائم ہوئی تو اس کے فیصلے سنت رسول اللہ اور سنت خلفائے راشدین میں شامل ہو جائیں گے۔ لیکن طلوع اسلام اس کہنے کی وجہ سے منکر حدیث اور مرتد قرار دیا گیا۔ اور امین احسن صاحب

عالم، بلند نظر اور متبحر عالم جس کی نگاہ خاک کے ذروں کا بھی جائزہ لیتی ہے اور مہد انجم کی گذرگاہوں کا بھی سفر کرتی ہے۔ دس بیس نہیں ہزاروں راتیں صرف قرآن کریم کے مطالعہ میں بسر کی ہیں۔ جس کی ذات قرآنی علوم کے لئے قابل وثوق سند ہے۔ قرآن کا مفسر اور حدیث و فقہ میں جس کی ژرف نگاہی مسلّم۔ (فاران کراچی جون ۱۹۵۳ء)

۲۔ غلام اور لونڈیاں

محترم نعیم صدیقی صاحب چراغ راہ بابت مارچ ۱۹۵۶ء میں مسٹر سہروردی پر تنقید کے ضمن میں لکھتے ہیں۔

اس ذہن میں اسلام کی جو ڈراؤنی تصویر سنی سنائی باتوں اور مستشرقین کی تحقیقاتوں نے بھر دی ہے۔ وہ ان اجزا پر مشتمل ہے (۱) اسلامی ریاست ہوگی تو جنگی قیدیوں کو غلام اور لونڈیاں بنایا جائے گا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

---

[1] اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جماعت اسلامی کو اب اپنی حکومت قائم کرنے کے امکانات قریب تر نظر آ رہے ہیں۔ (طلوع اسلام)

یعنی جنگی قیدیوں کو غلام اور لونڈی بنانا حقیقی اسلام کا جزو نہیں بلکہ مستشرقین کی تحقیق ہے اور سنی سنائی باتوں پر مشتمل؛
ہم محترم صدیقی صاحب کو ان کی اس حق گوئی پر مبارک باد دیتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ان سے یہ بھی پوچھنا چاہتے ہیں کہ
اب ان کا اپنے امیر سید ابو الاعلیٰ صاحب مودودی کے متعلق کیا ارشاد ہے۔ جنہوں نے (طلوع اسلام کی مخالفت میں) صفحات کے
صفحات اس "حقیقت" کو ثابت کرنے میں لکھائے تھے (اور وہ اب ان کی مستقل تصنیف کا جزو ہیں۔ اور ان کی تفسیر میں بھی
شامل) کہ اسلامی حکومت میں جنگ کے قیدیوں کو غلام اور لونڈیاں بنایا جائے گا۔! کیا ہم صدیقی صاحب سے اس کی توقع کریں
کہ وہ اپنے امیر کے خلاف بھی حق گوئی کا ثبوت دیں گے؟ لیکن یہ مشکل ہے۔

۳۔ اب تو آپ سمجھ گئے؟

جب یہ کہا جاتا ہے کہ ہمارے دور ملوکیت میں آہستہ آہستہ بہت سی غیر اسلامی باتیں اسلام میں داخل ہو گئیں، تو یہ سوال اکثر ذہنوں کو پریشان کر دیتا ہے کہ جب اس زمانے میں ہمارے اسلاف میں اتنے بڑے بڑے علماء اور جلیل القدر ائمہ موجود تھے۔ تو انہوں نے ان باتوں کے خلاف لب کشائی کیوں نہ کی؟
یہ سوال تاریخ سے متعلق ہے۔ اس لئے اس کی بابت حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ ایسا کس طرح ہوا۔ لیکن جو کچھ اب ہمارے سامنے ہو رہا ہے۔ اس سے تو ہم جان سکتے ہیں کہ بڑے بڑے علماء اور مجتہدین کی موجودگی میں کس طرح وہ باتیں عین کتاب و سنت کے مطابق تسلیم کر لی جاتی ہیں، جنہیں یہ حضرات اس سے پہلے خود خلاف شریعت قرار دیا کرتے تھے، مثلاً یہ حقیقت کسی سے پوشیدہ نہیں کہ پاکستان کے تمام علماء اس پر متفق تھے کہ (۱) اسلام میں جنگی قیدیوں کو غلام اور لونڈیاں بنایا جا سکتا ہے اور (۲) اگر کوئی مسلمان اپنا مذہب چھوڑ دے تو اس کی سزا موت ہے۔ وہ ان دونوں چیزوں کو کتاب و سنت کی رو سے صحیح ثابت کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگاتے تھے۔ اور جو شخص ان کی صحت میں شبہ کرتا، وہ اسے دائرۂ اسلام سے خارج بتلاتے تھے۔ اس کے بعد کیا ہوا؟
پاکستان میں نیا دستور بنا جس میں اس بنیادی اصول کو تسلیم کیا گیا کہ اس میں کوئی قانون کتاب و سنت کے خلاف نہیں ہو گا
اور اس دستور میں یہ دونوں شقیں رکھی گئی ہیں کہ (۱) کسی کو غلام اور لونڈی نہیں بنایا جائے گا۔ اور (۲) ہر شخص کو تبدیلی مذہب کی آزادی ہوگی۔

اور پاکستان کے تمام علمائے کرام نے اس آئین کو اسلامی قرار دے کر حکومت کو مبارکباد کے تار بھیجے۔ اور ان میں سے کسی ایک نے (یاد رکھئے، کسی ایک نے بھی) اتنا نہیں کہا کہ یہ دونوں شقیں خلاف شریعت ہیں۔

ہمارے بعد یہی علمائے کرام آنے والوں کے نزدیک "سلف صالحین" قرار پائیں گے۔ اور ان کے نام سلام و رحمت کے ساتھ لئے جائیں گے۔ اور اس بات کو بطور سند اور دلیل پیش کیا جائے گا، کہ اگر یہ چیزیں خلاف شریعت ہوتیں تو اس زمانے کے ایسے جلیل القدر علمائے کرام خاموش کس طرح رہتے۔ اور جب کوئی شخص مودودی صاحب کی وہ کتابیں پیش کرے گا، جن میں انہوں نے ان دونوں چیزوں کو کتاب و سنت کے خلاف ثابت کرنے کی کوشش کی تھی، تو گرم رد عقیدت مند فوراً کہہ

(باقی صفحہ ۶۲ پر)

نقد و نظر

آپ نے میلوں ٹھیلوں میں بھگدڑ مچتے تو دیکھی ہوگی۔ لیکن اس کا خیال نہیں کیا ہوگا کہ وہ مچتی کیسے ہے؟ اس کا طریقہ بڑا آسان ہے۔ ایک شخص بھاگنا شروع کر دیتا ہے۔ بھاگتا چلا جاتا ہے اور چلاتا جاتا ہے کہ "آگئے آگئے"۔ اس کے پیچھا اور لوگ بھاگنا اور "آگئے آگئے" کا شور مچانا شروع کر دیتے ہیں۔ بس دیکھتے ہی دیکھتے چاروں طرف سے لوگ بھاگنا شروع کر دیتے ہیں۔ اور اس طرح بھگدڑ مچ جاتی ہے۔ کوئی کسی سے نہیں پوچھتا نہ ہی خود کھڑے ہو کر سوچتا ہے کہ لوگ کیوں بھاگ رہے ہیں۔ کون آگئے ہیں؟ کیا ہو گیا ہے۔ یہ پریشانی کیوں ہے؟

یہ بھگدڑ جہلا میں مچا کرتی تھی۔ لیکن ہماری بدقسمتی کہ اب ہمارے علمی اور مذہبی طبقوں میں بھی اس قسم کی بھگدڑ مچنا شروع ہو گئی ہے۔ بات یوں ہوئی کہ جب جماعت اسلامی والوں نے یہاں اپنا مقدس جال پھیلانا شروع کیا تو انہیں سب سے زیادہ خطرہ طلوع اسلام کی طرف سے محسوس ہوا۔ وہ جانتے تھے کہ یہ ان کے عزائم سے باخبر ہے۔ اور خریدا جا نہیں سکتا۔ اس لئے یہ ان کی نقاب دری میں ہر ممکن کوشش کرے گا۔ اس کی روک تھام کے لئے آسان طریقہ یہی ہو سکتا تھا کہ اس کے خلاف اتہامات تراشے جائیں۔ اور اسے بدنام کر دیا جائے۔ چنانچہ "غیر مذہبی" طبقہ میں تو انہوں نے مشہور کرنا شروع کر دیا کہ طلوع اسلام حکومت کا پرچہ ہے۔ اور مذہبی طبقہ میں یہ مشہور کر دیا کہ یہ "منکر حدیث" ہے۔ یہ دوسرا حربہ چونکہ جذباتی تھا۔ اس لئے زیادہ موثر ثابت ہوا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے بھگدڑ مچ گئی۔ "طلوع اسلام منکر حدیث ہے!" "پرویز منکر شان رسالت ہے۔ یہ کہتے ہیں تین نمازیں پڑھو۔ ان کے اسلام میں نہ ہی دن کے روزے فرض ہیں۔ ان کے نزدیک سیرت رسول اللہؐ کی کوئی حیثیت ہی نہیں"۔ یہ شور تھا جو چاروں طرف سے اٹھنا شروع ہو گیا۔ مضامین لکھے جا رہے ہیں۔ پمفلٹ شائع ہو رہے ہیں۔ کتابوں پر کتابیں مارکیٹ میں چلی آرہی ہیں (تجارت کی فروغ کے لئے یہ طریقہ بڑا کامیاب ہوتا ہے) لیکن کوئی اللہ کا بندہ یہ کچھ کہنے والوں سے اتنا نہیں پوچھتا نہ ہی خود کھڑے ہو کر سوچنے کی زحمت گوارا کرتا ہے کہ طلوع اسلام نے یہ کچھ کہاں لکھا ہے۔ پرویز نے لیا کچھ کہاں کہا ہے؟ بھگدڑ میں کون اس قسم کے سوال کرتا۔ اور کون سوچنے کھڑا ہوتا ہے؟

الاعتصام کا حدیث نمبر اس بھگدڑ کی ہراساتی کا تازہ شاہکار مجلہ الاعتصام کا حدیث نمبر ہے جو بڑے سائز اور بڑی ضخامت سے شائع ہوا ہے۔ الاعتصام جمعیت اہل حدیث کا ترجمان

ہے۔ جنھیں سنت رسول اللہؐ کی شدت کے ساتھ اتباع کا دعویٰ ہے۔ ہم ارکان الاعتصام سے باادب دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ کیا سنت رسول اللہؐ نے انھیں یہی سکھایا ہے کہ کسی کے خلاف الزام عائد کرنے کے لئے محض سنی سنائی باتوں پر یقین کر لیا جائے اور اس کے ثبوت میں کسی سند کی ضرورت نہ سمجھی جائے۔ حتیٰ کہ جرم کا اعلان کرنے اور سزا کا فیصلہ سنانے سے پہلے مجرم کا بیان تک بھی سامنے نہ رکھا جائے؟ سنت رسول اللہؐ کے متعلق پرویز صاحب اور ادارہ طلوع اسلام کا جو مسلک ہے۔ اسے ہم نے ایک جامع مضمون میں قلمبند کر کے پمفلٹ کی شکل میں شائع کر دیا تھا۔ اور اس پمفلٹ کی ایک کاپی الاعتصام کی خدمت میں بھیج کر گذارش کی تھی کہ آپ اسے اپنے ہاں شائع فرما دیں۔ اور اس میں جو باتیں غلط نظر آئیں۔ اس پر تنقید فرمائیں۔ اس مضمون کو انھوں نے اپنے ہاں شائع نہیں کیا (حتیٰ کہ اس کا ذکر تک بھی نہیں کیا)۔ اور طلوع اسلام کی طرف ایسی باتیں منسوب کر دی ہیں جو اس نے کبھی نہیں کہیں۔

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہیں ۔۔۔۔ وہ بات ان کو بہت ناگوار گذری ہے

ہماری دوسری درخواست ارباب الاعتصام سے یہ ہے کہ علمی گفتگو میں متانت اور ثقاہت کو ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیئے۔ اگر آپ کسی کو غلطی پر سمجھتے ہیں۔ تو اسے اس کی غلطی پر متنبہ کیجئے۔ گالیاں تو نہ دیجئے۔

ضرورتِ حدیث

اس سلسلہ میں احمدیہ انجمن اشاعت اسلام، لاہور نے، اپنے امیر محترم صدر الدین صاحب کی کتاب بعنوان "ضرورتِ حدیث" شائع کی ہے۔ جس کا انداز وہی ہے۔ جو ان حضرات کے دوسرے لٹریچر کا ہوتا ہے۔ ہم اس کتاب کا تعارف نسبتاً تفصیل سے کرانا چاہتے ہیں۔

کتاب کے شروع میں لکھا ہے۔

> ان کا (یعنی ان کے خیال میں منکرین حدیث کا) عقیدہ ہے کہ حضور نبی کریمؐ کی اطاعت بحیثیت صدر ریاست یا بطور مرکزِ ملت تھی۔ اس لئے اب انکی جگہ مرکزِ ملت کی اطاعت کرنا یا اسمبلی کی اطاعت کرنا مسلمانوں کا فرض ہو گیا ہے۔ اور اسی کو اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول کی اطاعت یقین کیا جائے گا۔ یعنی خدا اور رسول سے مراد وہ مرکزِ ملت ہو گا۔ جو قوانین نافذ کیا کرے گا۔

محترم صدر الدین صاحب کی خدمت میں گذارش ہے کہ آپ نے ہمارے مسلک کو صحیح طور پر بیان نہیں کیا۔ ہمارا کہنا یہ ہے کہ اللہ اور رسول کی اطاعت اس نظام کی رُو سے ہوتی تھی۔ جسے رسول اللہؐ نے متشکل فرمایا تھا۔ حضورؐ کی وفات کے بعد اس نظام کو حضورؐ کے خلفاءؓ (جانشینوں) نے قائم رکھا۔ اس لئے ان کی اطاعت بمنزلہ "خدا اور رسولؐ کی اطاعت" کے تھی۔ یہ سلسلہ زیادہ دیر تک قائم نہ رہا۔ اب اگر اسی قسم کا نظام پھر سے متشکل ہو جائے۔ جسے رسول اللہؐ نے قائم فرمایا تھا۔ یعنی قرآنی احکام کو علیٰ منہاج نبوت نافذ کرنے والا نظام تو خدا اور رسول کی اطاعت کا عملی مفہوم اس نظام کی اطاعت ہوگا۔ یہ خیال "منکرین حدیث" کا نہیں بلکہ خود رسول اللہؐ کی ان احادیث سے بھی یہی ثابت ہے۔ جنھیں قرآن کے مطابق

ہونے کی وجہ سے صحیح قرار دیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ مشکوٰۃ (کتاب الامارۃ والقضاء) میں (بحوالہ بخاری اور مسلم) یہ حدیث موجود ہے کہ

رسول اللہؐ نے فرمایا کہ جس شخص نے میری اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی۔ اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے خدا کی نافرمانی کی۔ اور جس نے امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی اور جس نے امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی۔"

اور (مسلم کے حوالہ سے) یہ حدیث بھی کہ

رسول اللہ نے فرمایا کہ اگر تمہارے اوپر کسی نکٹے غلام کو حاکم بنایا جائے۔ اور وہ تم پر کتاب اللہ کے مطابق حکمرانی کرے تو تم اس کی اطاعت کرو۔ اور اس کا حکم مانو۔

طلوع اسلام بھی یہی کہتا ہے۔ اور آپ یہ سنکر حیران ہوں گے کہ خود محترم مصنف کا بھی یہی عقیدہ ہے۔ چنانچہ آپ صفحہ ۲۹ پر فرماتے ہیں۔

حضور نبی کریم نے حکام وقت کی فرمانبرداری کرنے پر زور دیا ہے۔ اور امیر کی اطاعت کو اپنی اطاعت قرار دیا ہے۔ لیکن جب حاکم وقت یا امیر یا خلیفہ احکام الٰہی سے انحراف کرے تو اس کے خلاف احتجاج کرنا بھی نہایت ہی ضروری قرار دیا۔

طلوع اسلام بھی یہی کہتا ہے کہ اطاعت اسی نظام کی کی جائے گی۔ جو امت کو احکام الٰہی کے مطابق چلائے گا۔ اور یہ اطاعت بمنزلہ خدا اور رسول کی اطاعت کے ہوگی۔

اس کے بعد محترم مصنف فرماتے ہیں۔

مذکورہ بالا عقائد کے علاوہ ان کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ جب حضورؐ نے قرآنی حکومت کو متشکل فرمایا تو حضورؐ کے سامنے صرف عربوں کی قوم تھی۔ اور اس قوم کو مدنظر رکھتے ہوئے حضورؐ نے قوانین مرتب کئے تھے۔ لہٰذا ان قوانین کو عمومیت کا رنگ نہیں دیا جا سکتا۔ پرویز صاحب نے اپنے اس خیال کی تائید میں اپنے پیر و مرشد[1] علامہ اقبال کی تحریر پیش کی ہے۔ علامہ صاحب لکھتے ہیں کہ رسول اللہؐ کے سامنے ان کی اپنی قوم کے عادات و خصائل تھے۔ اور ان ہی کو ملحوظ رکھتے ہوئے حضورؐ نے قرآن کے اصولوں کی تفسیر فرمائی تھی۔ اور اپنے زمانے ہی کی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے آپ نے قرآنی اصولوں کی تفصیلات کو مرتب فرمایا تھا۔۔۔۔۔ اس لئے اگر آج یہ ثابت بھی ہو جائے کہ فلاں حدیث یقینی طور پر صحیح ہے۔ تو اس کا مفہوم یہ ہو گا کہ رسول اللہ نے اپنے زمانے میں اس طرح عمل کیا تھا۔

---

[1] واضح رہے کہ پرویز صاحب مدت ہوئی "پیری اور مرشدی" کے چنگل سے آزادی حاصل کر چکے ہیں۔ وہ اللہ کے سوا کسی کو مرشد نہیں مانتے۔ یہی قرآن کا حکم ہے (طلوع اسلام)

> لیکن بعد میں کسی وقت اگر مرکزِ ملت یہ سمجھے کہ اس حدیث میں رد و بدل کی ضرورت ہے تو اس میں وہ رد و بدل کر سکے گا۔ اور اسے حق ہو گا کہ وہ قرآنی اصولوں کی بنا پر ضروری جزئیات خود مرتب کرے۔ جس طرح رسول اللہؐ نے اپنے ماحول اور اپنے زمانے کی ضروریات کے پیشِ نظر ان اصولوں کی جزئیات مرتب فرمائی تھیں۔ یہ خیالات بالبداہت غیر معقول ہیں اور تعلیمات قرآنیہ اور دنیائے اسلامیہ کے مسلّم عقائد کے خلاف ہیں۔

آپ نے تنقید ملاحظہ فرمائی؟ "یہ خیالات بالبداہت غیر معقول ہیں": بتلایئے! اس دلیل کا کوئی کیا جواب دے۔

"تعلیمات قرآنیہ کے خلاف ہیں": اس کے لئے قرآن کی سند کی ضرورت ہے۔

"دنیائے اسلام کے مسلّم عقائد کے خلاف ہیں": محترم مصنف کو جوشِ مخالفت میں یہ یاد نہیں رہا کہ یہ دلیل خود ان کے اپنے خلاف جاتی ہے۔ اگر اس بات کو بطور اصول مان لیا جائے کہ جو بات دنیائے اسلام کے مسلّم عقیدہ کے خلاف ہو، وہ غلط اور غیر معقول ہوتی ہے تو اس کا کیا جواب ہے کہ آج (بجز مرزائی حضرات کے) دنیا کے تمام مسلمانوں کا مسلّمہ عقیدہ ہے کہ مرزا غلام احمد صاحب اپنے دعوے میں جھوٹے اور مفتری علی اللہ تھے۔

اب اس دعوے کی دلیل ملاحظہ ہو۔ آپ فرماتے ہیں۔

> منکرینِ حدیث یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ چودہ سو سال سے مسلمانوں کے دلوں میں جو عشقِ رسولِ کریمؐ کے متعلق اور حضورؐ کے ارشادات کے متعلق متمکن ہو چکا ہے۔ وہ بے بنیاد ہے اور اسلام کی حقیقت جو ائمہ محدثین نے سمجھی تھی۔ اور جنھوں نے بخاری و مسلم و ابن ماجہ و ابو داؤد و ترمذی و موطا و نسائی ایسی بے نظیر کتابیں نہایت محنت و مشقت اور اخلاص کے ساتھ تیار کر کے دین کی ترویج کی تھی۔ ان کی وہ ساری کی ساری محنت عبث ہے۔ اور ائمہ اربعہ یعنی امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ کی تمام عمر کی محنت محض بیکار ہے۔ اور ان کے علم و فضل اور تقویٰ کی قطعاً کوئی قدر و منزلت باقی نہیں ہے۔ اور اس طرح سے وہ عظیم الشان تفاسیر جن کی وجہ سے قرآن کریم کے معانی و معارف، اسلامی دنیا پر روشن ہوئے۔ وہ سب ناقابلِ اعتماد ہیں کیونکہ ان کی بنیاد بھی علمِ حدیث پر ہے۔ اور وہ شروح جو جلیل القدر علماء نے کتبِ احادیث کے معانی واضح کرنے کے لئے لکھی تھیں۔ وہ قابلِ اعتبار نہیں ہیں۔ نیز یہ کہ مصر نے جو صدیوں سے اسلامی کتب کی اشاعت پر کمر باندھ رکھی ہے۔ وہ بے سود کام ہے۔"

دلیل آپنے ملاحظہ فرمالی! کیا اسے اس دعوے کے ساتھ کوئی ربط اور تعلق ہے۔ جس کی تردید میں اسے پیش کیا گیا ہے! ہم نے اس طویل عبارت کو اس لئے نقل کر دیا ہے کہ وہ لوگ جو یہ کہا کرتے ہیں کہ احمدی حضرات (بالخصوص لاہوری) جو مشرقی اور مغربی علوم پر ایسی

دستگاہ رکھتے ہیں۔ اور یورپ جاکر تبلیغ اسلام کرتے ہیں۔ ان کا عقیدہ اور مسلک غلط کس طرح ہوسکتا ہے۔ وہ بچشم خویش دیکھ لیں کہ ان حضرات کے پاس اپنے دعاوی کے دلائل کس قسم کے ہوتے ہیں۔

جس عقیدے کے متعلق محترم مصنف نے لکھا ہے کہ "اسے پرویز کے پیر و مرشد اقبال نے پیش کیا ہے" اور جسے وہ بالبداہت غیر معقول تعلیمات قرآنیہ اور دنیائے اسلام کے مسلمہ عقائد کے خلاف" اور نہایت ضرر رساں۔ اور نہایت ہی دل آزار اور دین کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے والا" قرار دے رہے ہیں۔ اس کے متعلق عرض ہے کہ علامہ اقبال نے اس عقیدہ کو امام ابوحنیفہؒ اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے حوالے سے پیش کیا ہے و افسوس ہے کہ جناب مصنف علامہ اقبال کی عبارت کے اس حصہ کو حذف کر گئے ہیں کیا وہ فرمائیں گے کہ امام ابوحنیفہؒ اور شاہ ولی اللہ کے متعلق ان کا کیا خیال ہے؟ اور آگے بڑھیے یہ خیال صرف اقبال، امام ابوحنیفہ اور شاہ ولی اللہ دہلوی ہی کا نہیں۔ خود حضرت عمرؓ کا بھی یہی خیال تھا۔ اور اسی پر وہ اپنے زمانہ خلافت میں عمل پیرا ہے۔ کتب احادیث و آثار میں بیسیوں واقعات ایسے ملتے ہیں۔ جن میں حضرت عمرؓ نے رسول اللہ کی متعین فرمودہ جزئیات اور صادر فرمودہ فیصلوں میں اپنے زمانہ کے اقتضاآت کے مطابق رد و بدل کیا۔ چنانچہ ان میں سے ایک فیصلے کے متعلق بحث کرتے ہوئے امام ابن تیمیہؒ نے لکھا ہے کہ

> عہد حضرت عمرؓ کی سیاست کا تقاضا یہی تھا کہ بیک وقت دی ہوئی تین طلاقوں کو بائنہ مان لیا جائے دحالانکہ رسول اللہؐ کے زمانے میں ایسی طلاق کو تین نہیں بلکہ ایک طلاق ہی تصور کیا جاتا تھا۔ (طلوعِ اسلام)

طلوعِ اسلام یہی کہتا ہے کہ دین میں تعین جزئیات کا صحیح منشا، وہی ہے۔ جسے حضرت عمرؓ نے اختیار کیا۔ اور جس کی تائید امام ابوحنیفہ۔ امام ابن تیمیہؒ اور شاہ ولی اللہ نے کی (اور جس کے متعلق علامہ اقبال کا جرم صرف اس قدر ہے کہ انہوں نے اسے اپنے ہاں نقل کر دیا) حضرت عمرؓ کا یہ مسلک قرآن کی تعلیم اور منشائے رسالت کے عین مطابق تھا۔ اور ملت اسلامیہ میں جب پھر قرآنی نظام علیٰ منہاج نبوت قائم ہوگا۔ تو وہ اسی مسلک کو اختیار کرے گا۔

یہاں ایک دلچسپ بات سنیئے۔ آپ نے دیکھا ہے کہ محترم مصنف نے علامہ اقبال کی عبارت نقل کر کے اس پر تنقید کی ہے۔ اس کے بعد ص۱۸۱ پر ہمیں یہ عبارت ملتی ہے۔

> "ایک منکر حدیث نے اپنے پیر و مرشد علامہ اقبال کی عبارت اپنے عقیدے کی تائید میں پیش کی ہے کہ حضور نبی کریمؐ کے نظریے تو عالمگیر تھے۔ لیکن ان کے اعمال اپنی قوم کے ساتھ ہی وابستہ تھے ..... خدا جانے کیوں یہ نہایت درجے کی بے ادبی اور گستاخی اقبال کی طرف منسوب کی گئی ہے۔ مریدنے اپنے مرشد کو بے ادب ہی نہیں کم علم بھی ثابت کر دکھایا ہے۔"

مرزائی صاحبان کو علامہ اقبال اور طلوعِ اسلام کے خلاف جو بغض ہوسکتا ہے۔ وہ ظاہر ہے۔ لیکن پُرلطف بات یہ ہے کہ خود

اقبال کی عبارت کے متعلق کہتے ہیں کہ اسے اقبال کی طرف کیوں منسوب کیا گیا ہے؟ با ادب گذارش ہے کہ دیانت کا تقاضا یہی ہے کہ جس کی عبارت ہو اسے اسی کی طرف منسوب کیا جائے۔

طلوع اسلام کے مسلک کے متعلق زیر نظر کتاب میں بس اتنا ہی حصہ ہے۔ جو اوپر درج کیا جا چکا ہے۔ کتاب کے باقی تین سو صفحات ان باتوں کی تردید میں ہیں۔ جن میں سے کوئی بات بھی طلوع اسلام نہیں کہتا۔ یا ایسی باتیں جو محض جذباتی طور پر لکھدی جاتی ہیں۔

مثلاً تحریر ہے۔

> یہ لوگ قرآن کریم کی واضح تعلیمات کے خلاف جہاد میں مصروف ہیں۔ قرآن کریم حضور نبی کریم کے حالات کا مطالعہ کرنے کی تاکید کرتا ہے۔

محترم مصنف نے اپنی کتاب میں پرویز صاحب کا نام خصوصیت سے لیا ہے۔ مندرجہ بالا الزام اس پرویز کے خلاف عائد کیا جا رہا ہے۔ جس نے اپنی ساری زندگی قرآنی تعلیم کو عام کرنے میں صرف کر دی ہے۔ اور جس کی ایک کتاب (معارف القرآن) اس وقت تک پانچ ضخیم جلدوں میں شائع ہو کر اندرون اور بیرونِ ملک کے تعلیم یافتہ طبقہ سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہے۔ اور نبی اکرمؐ کی سیرتِ مقدسہ پر جس پرویز کی ضخیم تصنیف (معراج انسانیت) ہزاروں نوجوانوں کو ذاتِ رسالتمآبؐ کے علو مرتبت کا گرویدہ بنا چکی ہے۔

ہم محترم مصنف سے گذارش کریں گے کہ کسی کے خلاف الزام دھرنے سے پہلے اس کے متعلق صحیح معلومات تو بہم پہنچا لینی چاہئیں۔

یا مثلاً ارشاد ہے۔

> ان کا رسول اللہ کے لئے مختلف حیثیتیں قائم کرنا پرلے درجے کی گستاخی ہے اور اس قسم کی سعی نہایت درجے نقصان رساں ہے۔ کبھی ان کو رسولِ خدا اور کبھی ان کو امام اور کبھی ان کو امیر اور کبھی ان کو صدرِ ملت اور کبھی انسان محض قرار دینا بالکل باطل اور غیر معقول اور بے حد مضر ہے۔ اور خدا کی منشاء کے بالکل خلاف کیونکہ (دلیل کو بغور ملاحظہ فرمائیے۔ طلوع اسلام) خدا نے ان کے حق میں ورفعنا لک ذکرک فرمایا ہے۔ اور انہیں مقام محمود پر کھڑا کیا ہے۔ صفحہ ۲۴)

یہ کہنا تو ان حضرات کے لئے کافی نہیں ہوگا کم از کم حضورؐ کی شہری حیثیت کا فرق خود اللہ تعالیٰ نے بھی کیا ہے۔ لیکن یہ کہنا تو ان کے لئے سند ہونا چاہیئے کہ اس حیثیت کا امتیاز خود ان کے امیر اول (محترم محمد علی مرحوم) نے بھی کیا ہے۔ چنانچہ وہ اپنی تفسیر القرآن میں آیہ ما ینطق عن الھویٰ کے تحت لکھتے ہیں۔

> وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ - إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ (۵۳/۳-۴) میں (ھو) کی ضمیر کو نطق کی طرف لینا اس لئے درست نہیں کہ یہ کسی کے نزدیک بھی مسلم نہیں کہ آپ کا سارا کلام یا کم از کم

> نبوت کے بعد کا ہی سارا کلام وحی سے تھا۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ آپ کا اجتہاد بھی وحی خفی کی روشنی سے تھا۔ مگر پھر بھی اس کا تعلق کو مسائل دین پر محمول کرنا پڑے گا۔

یعنی (۱) حضورؐ کا سارا کلام وحی کی رو سے نہیں تھا۔

(۲) حضورؐ کا اجتہاد وحی خفی کی روشنی سے تھا۔ مگر وہیں تک جہاں تک دینی مسائل کا تعلق ہے۔

(وحی خفی کی بحث کو چھوڑیئے کہ قرآن تو ایک طرف خود عہد رسالتمآبؐ میں بھی اس اصطلاح کا کہیں وجود نہیں ملتا) مندرجہ صدر اقتباس سے اتنا تو واضح ہے کہ محترم محمد علی مرحوم حضورؐ کے اس کلام میں جو دینی مسائل سے متعلق تھا۔ اور اس میں جو غیر دینی مسائل سے متعلق ہوتا تھا۔ فرق کرتے ہیں۔ اسی کو حضورؐ کی شہری حیثیت کہتے ہیں۔ لہٰذا اگر یہ گستاخی ہے تو سوچئے کہ آپ اپنے امیر اول کے متعلق کیا فرما رہے ہیں۔

ترے نشتر کی زد شریانِ قیسِ ناتواں تک ہے

باقی رہی حضورؐ کی امیر یا امام امت کی حیثیت۔ سو اس کے لئے بھی طلوع اسلام تنہا مجرم نہیں۔ طلوع اسلام کا کہنا یہ ہے کہ قرآن نے جہاں نظم اجتماعی کے سلسلہ میں اللہ و رسول، کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ اس سے مفہوم نظام اسلامی اور اس نظام کا مرکز ہے۔ اس باب میں "اسلاف" کے اقوال ملاحظہ فرمایئے۔ امام ابن جریر طبریؒ سورہ انفال کی آیت (قل الانفال للہ والرسول) کی تفسیر میں مختلف اقوال نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ "یہ وہ اضافے ہیں جو امام وقت بعض یا کل فوج کے لئے کرتا ہے (ھی زیادات یزیدھا الامام لبعض الجیش او جمیعھم) اسی طرح امام رازی نے آیت انما جزاء الذین یحاربون اللہ ورسولہ (۳۳ٍ) کے تحت امام ابوحنیفہ کا یہ قول نقل کیا ہے فالامام مخیر فیہ بین ثلاثۃ اشیاء۔ امام کو اختیار ہے کہ تینوں سزاؤں میں سے جو سزا چاہے دے۔ اسی آیت کی تفسیر میں علامہ جلال الدین سیوطی الدر المنثور میں یہ روایت درج کرتے ہیں کہ "سعید بن مسیب حسن بصری اور ضحاک نے کہا ہے کہ محارب کے معاملہ میں امام کو اختیار ہے جو چاہے کرے۔ اسی طرح نواب صدیق حسن خاں مرحوم نے فتح البیان میں" اللہ اور رسول کے خلاف جنگ کے متعلق لکھا ہے کہ:۔

> حضرت ابن عباس۔ سعید بن المسیب، مجاہد۔ عطاء۔ حسن بصری۔ ابراہیم نخعی۔ ضحاک اور ابو ثور نے کہا ہے کہ جس نے اسلامی مملکت (دولۃ الاسلام) میں ہتھیار اٹھایا۔ اور راستوں کو پرخطر کر دیا۔ اور پھر وہ گرفت میں آگیا۔ تو اس کے بارے میں مسلمانوں کے امام کو اختیار ہے کہ جو سزا چاہے دے)

ان مثالوں سے واضح ہے کہ "اللہ اور رسول" سے مراد امام ملت اسلامیہ لینا دین میں "فتنہ انگیزی" نہیں۔ بلکہ یہ وہ مفہوم ہے جو خود صحابہؓ سے ثابت ہے۔

احادیث کی حفاظت کے متعلق محترم مصنف فرماتے ہیں:

ان فرائض کی ادائیگی کے متعلق جو ارشادات یا احادیث حضور کی زبان سے صادر ہوئیں، ان کی حفاظت بھی اللہ تعالےٰ نے اپنے ذمے لے رکھی تھی۔ (ص ۲۹۴)

قرآن کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ہم نے اسے نازل کیا۔ اور ہم ہی اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں۔ اس ذمہ داری کا نتیجہ ہے کہ قرآن کا ایک ایک لفظ ایک کتاب کی شکل میں محفوظ چلا آرہا ہے۔ اور امت میں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اس کتاب کی فلاں آیت فی الواقعہ قرآن کی آیت ہے، یا نہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر احادیث کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے لے لی تھی، تو وہ کون سی کتاب ہے۔ جس کی ایک ایک حدیث کے متعلق تمام مسلمانوں کا ایمان ہے کہ وہ لفظاً لفظاً رسول اللہ کا ارشاد ہے۔ اور جس کی کسی حدیث کے متعلق یہ سوال نہیں اٹھا کہ وہ فی الواقعہ قول رسول اللہ ہے یا نہیں۔ بخاری شریف کو اصح الکتب بعد کتاب اللہ کہا جاتا ہے۔ اس کی اور دیگر صحاح کی احادیث کے متعلق خود (سابق) امیر جماعت احمدیہ (محترم محمد علی مرحوم) فرماتے ہیں۔

میرے نزدیک سب سے ضروری بات یاد رکھنے کے قابل یہ ہے کہ احادیث نقص گو وہ صحیح بخاری یا صحاح میں ہوں۔ اس قابل نہیں ہوتیں کہ ان کے ایک ایک لفظ کو نبی کریم (ص) کی طرف وثوق کے ساتھ منسوب کیا جاسکے۔ (تفسیر ص ۱۱)

فرمائیے! کیا اللہ تعالےٰ کی حفاظت کا نتیجہ یہی ہونا چاہیئے تھا!

اور آگے بڑھئے۔ حدیثوں کے متعلق خود مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ

جو شخص حکم ہو کر آیا ہے۔ اس کو اختیار ہے کہ حدیثوں کے ذخیرہ میں سے جس انبار کو چاہے۔ خدا سے علم پا کر قبول کرے۔ اور جس ڈھیر کو چاہے۔ خدا سے علم پا کر رد کر دے۔

(تحفہ گولڑویہ)

فرمائیے! جس مجموعہ کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالےٰ نے لے لیا ہو کیا اس کی حالت ایسی ہو گی کہ اس میں انبار در انبار ایسی حدیثیں ہوں جو رد کر دینے کے قابل ہوں! کیا قرآن کی بھی یہی کیفیت ہے کہ کوئی حکم۔ خدا سے علم پا کر۔ اس کے جس حصے کو چاہے رد کر دے۔ اور جس حصے کو چاہے قبول کرے!

اور اگر آپ یہاں محمود احمد صاحب کی روایت کو قابل یقین خیال فرماتے ہیں تو حدیثوں کے متعلق میرزا صاحب کا یہ قول بھی ملاحظہ فرمائیے۔

حضرت مسیح موعود فرمایا کرتے تھے کہ حدیثوں کی کتابوں کی مثال مداری کے پٹارے کی ہے جس طرح مداری جو چاہتا ہے۔ اس میں سے نکال لیتا ہے۔ اسی طرح ان سے جو چاہو نکال لو۔

(الفضل - بابت ۱۵ر جولائی ۱۹۲۴ء)

یہ ہے احادیث کے مجموعوں کی حیثیت میرزا صاحب کے نزدیک، جن کے متعلق امیر جماعت احمدیہ کا ارشاد ہے کہ ان کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے لے رکھی تھی۔

اور یہ ہے اس تصنیف کا اجمالی سا تعارف جسے امیر جماعت احمدیہ (لاہور) نے منکرین حدیث کے رد میں شائع کیا ہے۔ روایات کی مدافعت میں ان حضرات کی یہ تڑپ و خلش، غم و غصہ اور ہراسانی و پریشانی قابل فہم ہے۔ مرزا صاحب کے تمام دعاوی کا مدار کلیۃً روایات پر ہے۔ اگر یہ حضرات روایات کو دین تسلیم نہ کریں تو میرزا صاحب کے دعاوی کی کوئی حیثیت ہی باقی نہیں رہتی۔ ہم ایسا لکھنے میں محض قیاس یا سوءِ ظن سے کام نہیں لے رہے ہیں، ایک حقیقت کا بیان کر رہے ہیں۔ اور وہ حقیقت خود زیر تبصرہ کتاب کے سواحل سے اچھل اچھل کر باہر آ رہی ہے۔ چنانچہ اس میں ایک تفصیلی باب "پیش گوئیاں اور کشوف و رویا" کے عنوان سے ہے۔ جس کا آغاز ان سطور سے ہوتا ہے۔

> اب ان احادیث پر بحث کی جائے گی۔ جن میں پیش گوئیاں اور کشف و رویا کا ذکر ہے جن لوگوں نے حدیث کے اس حصہ کا انکار کیا ہے۔ ان کے سامنے کوئی بلند مقصد نہیں۔ بلکہ ان کا مقصد کسی ایسی ہستی کا انکار کرنا ہے۔ جس نے نمایاں طور پر خدمت دین کر دکھائی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ مقصد نہایت گرا ہوا ہے۔ ان خیالات کا سرچشمہ حسد بھی ہے۔ اور کم ظرفی بھی۔ (ص ۱۲۹)

یہ تھا مطلع۔ اب حسن مطلع ملاحظہ ہو۔ عنوان ہے۔

بعثتِ مجددین کے متعلق حضور کی پیش گوئیاں

اس کے نیچے یہ عبارت درج ہے۔

> مذکورۃ الصدر تصانیف کی روشنی میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ایک اور پیش گوئی کا ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے یہ پیش گوئی حدیث میں درج ہے۔ حضور نے فرمایا۔
>
> ان اللہ یبعث لھذہ الامۃ علیٰ راْس کل مائۃ سنۃ من یجدد لھا دینھا۔
>
> یعنی اللہ تعالیٰ امت مرحومہ کی بھلائی کے لئے ہر سو سال کے سر پر ایک مجدد مبعوث کیا کرے گا جو اس کے دین کی تجدید کیا کرے گا۔ اس پیش گوئی کی صداقت پرکھنے کا سب سے زیادہ صحیح طریق یہ ہے کہ مدعی مجددیت کی صحبت سے فیضیاب ہونے والے اشخاص کو دیکھا جائے۔ اور اندازہ لگایا جائے کہ آیا وہ خدا پرست بن گئے ہیں۔ اور ان کے اخلاق پسندیدہ نظر آتے ہیں۔ آیا ان میں تقویٰ و طہارت پیدا ہو گیا ہے...... (ص ۱۵۵)

اس کے بعد لکھا ہے کہ ۱۳۱۱ھ میں ماہ رمضان میں، چاند اور سورج دونوں کو گرہن لگا۔

> یہ واقعہ مدعی مجددیت ومہدویت (؟) کی صداقت پر نہایت ہی واضح اور نہایت ہی روشن اور نہایت ہی موثر شہادت ہے۔ اس واقعہ کو شہادت کیونکر قرار دیا جاتا ہے؟ اس لئے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پیش گوئی کی تھی کہ آخری زمانے کے مہدی کی سچائی کو ظاہر کرنے کے لئے ماہ رمضان میں سورج اور چاند دونوں کو گرہن لگے گا۔ (صفحہ ۱۵۷)...... منکرین حدیث پر حجت قائم کرنے کے لئے یہ ایک ہی واقعہ کافی ہے (صفحہ ۱۵۸)

اور کتاب کے آخری صفحات میں درج ہے کہ۔

> مرزا غلام احمد (نے لکھا ہے کہ) حضور کے دین کی تجدید کرنا میرا فریضہ ہے۔ اور انہوں نے لکھا ہے کہ باب وحی نبوت بالکل مسدود ہے۔ اس لئے اب کسی شخص پر جبریل وحی نبوت لے کر نازل نہیں ہو سکتا۔ ہاں وحیٔ ولایت امت کے اولیاء پر نازل ہوتی ہے۔ اور ان اولیاء میں سے میں ایک ہوں۔ اور اس وحیٔ ولایت کا جاری رکھنا (جس کی کوئی سند قرآن سے نہیں مل سکتی طلوع اسلام) محض اس لئے ہے کہ تاکہ ایمان تازہ ہوتا رہے۔ اور تاکہ دین متین کی تجدید تائید ہوتی رہے (صفحہ ۱۶۱)

لہٰذا ان حضرات کا روایات کے بارے میں جوش اور شدت قابل فہم ہے۔

حکایت قد آں یار دل نواز کنم ۔۔۔ بایں فسانہ مگر عمر خود دراز کنم

اس ضمن میں ہم ان تمام حضرات کی خدمت میں جو اس باب میں دلچسپی رکھتے ہیں، با دب گذارش کریں گے کہ دین میں حدیث کے صحیح مقام کا سوال خالص دینی اور علمی ہے۔ اس لئے اس کے متعلق گفتگو بھی دینی اور علمی انداز سے ہونی چاہیئے۔ ہو سکتا ہے آپ کو کسی کے مسلک سے اختلاف ہو اور آپ اسے غلطی پر سمجھیں۔ لیکن اس کی غلطی کے ازالہ کے لئے گالیوں پر اتر آنا۔ اور ہنگامہ برپا کرنا نہ مؤثر طریق ہے۔ نہ ہی قابل ستائش عمل۔ حدیث کے بارے میں طلوع اسلام کے سامنے جو اشکال ہیں۔ وہ مختصر الفاظ میں یہ ہیں کہ

(۱) اگر رسول اللہؐ کے ارشادات دین کا جزو لاینفک تھے اور انہیں امت کے لئے قیامت تک کے لئے واجب الاطاعت بننا تھا تو کیا یہ چیز حضورؐ کے فریضۂ رسالت میں داخل نہ تھی کہ آپ ان ارشادات گرامی کا ایک مستند مجموعہ امت کو دے جاتے تاکہ ان کے متون کے متعلق کسی کو اختلاف نہ ہوتا؟ لیکن یہ واقعہ ہے کہ اس قسم کا مجموعہ حضورؐ نے مرتب نہیں فرمایا تھا کہ حضورؐ کے بعد خلفائے راشدینؓ نے بھی ایسا نہیں کیا۔ اس کی کیا وجہ تھی؟

(۲) کتب روایات و آثار سے پتہ چلتا ہے کہ کئی ایک معاملات میں حضرت عمرؓ نے نبی اکرمؐ کے فیصلوں میں رد و بدل کیا (مثلاً تطلیقات ثلاثہ کے معاملہ میں) اگر رسول اللہؐ کے یہ فیصلے مبنی بر وحی تھے۔ اور قیامت تک کے لئے اٹل اور غیر متبدل، تو حضرت عمرؓ نے ایسا کیوں کیا۔ اور دیگر صحابہ کبارؓ (بلکہ ان کے بعد بھی امت) نے حضرت عمرؓ کے ان فیصلوں کی مخالفت کیوں نہ کی؟ اگر حضرت عمرؓ ایسا کرنے کے مجاز تھے۔ تو اگر اس قسم کی خلافت علیٰ منہاج نبوت اب قائم ہو جائے۔ تو خلیفہ برحق اپنے زمانے کے حالات کے مطابق سابقہ فیصلوں میں ضروری تبدیلی کرنے کا مجاز ہوگا یا نہیں ہوگا۔ اگر نہیں تو کیوں نہیں؟

یہ ہیں ہماری اشکال، جن کے متعلق ہم ایک ایک سے درخواست کر چکے ہیں کہ وہ براہ کرم ان کے حل سے ہمیں مطلع فرمائیں۔ لیکن ہماری ان گذارشات کا جواب کسی نے نہیں دیا۔ البتہ گالیاں ہر ایک نے دی ہیں۔ اور ان کے ساتھ ہی ایسی ایسی باتیں ہماری طرف منسوب کی ہیں، جنھیں ہم نے کبھی نہیں کہا۔ ہم بار بار لکھ چکے ہیں کہ نماز روزہ تو ایک طرف، عام فقہی مسائل تک میں کسی فرد کو یہ حق حاصل نہیں کہ ان میں کوئی رد و بدل کرے۔ اگر حالات کے تقاضے سے ان میں کسی قسم کی تبدیلی کی ضرورت ہوگی۔ تو یہ تبدیلی (حضرت عمرؓ کی طرح) صرف وہ نظام کر سکے گا جو علیٰ منہاج نبوت قائم ہوگا۔ یہ ہے طلوع اسلام کا مسلک۔ اگر یہ مسلک قرآن کی رو سے غلط ہے تو ہم ان کے شکر گذار ہوں گے۔ جو ہم پر ہماری غلطی واضح کر دیں گے۔

حقائق و عبر (ص ۵۸ سے آگے)

بتھیں گے کہ ان کی کتابوں میں کسی شرارت پسند نے یہ باتیں بعد میں ملا دی ہوں گی۔ اور نرم رد یہ کہہ کر آنکھیں بند کر لیں گے کہ خطائے بزرگان گرفتن خطاست۔

اس ایک واقعہ سے آپ اندازہ لگائیے کہ اگر اس دور میں جب حکومت کی طرف سے ان امور کے متعلق کوئی سختی نہیں ہوتی، مصلحت کوشیاں علمائے کرام کے لبوں پر اس طرح مہریں لگا سکتی ہیں تو گذشتہ زمانے کی ملوکیت میں کیا کچھ نہیں ہوتا ہوگا؟ یاد رکھیے: انسانی دستبرد سے اگر کوئی چیز محفوظ رہ سکتی ہے۔ تو وہ صرف خدا کی کتاب ہے۔ اس لئے کسی بات کے اسلامی و غیر اسلامی ہونے کا معیار وہی کتاب ہو سکتی ہے۔ نہ کہ اشخاص۔

دفتر طلوع اسلام پہنچنے کے لئے:- اے بی بس میں بیٹھئے جو جمشید روڈ سے آگے سوسائٹی کی طرف جاتی ہے اور کنڈکٹر سے کہئے کہ وہ آپ کو اسلام آباد کے چوراہے پر اتار دے (جسے اب طلوع اسلام چوک بھی کہتے ہیں) اس چوراہے سے جو پہلی سڑک مغرب کی طرف گئی ہے۔ اس پر چوتھا مکان دفتر طلوع اسلام ہے۔

قرآنی انقلاب کا لٹریچر

معراجِ انسانیت (از پرویز) سیرت صاحب قرآن علیہ التحیہ والسلام کو قرآن کے آئینے میں دیکھنے کی پہلی اور کامیاب کوشش۔ مذاہب عالم کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر کے ساتھ ساتھ حضور سرورِ کائنات کی سیرت اور دین کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آگئے ہیں۔ بڑے سائز کے قریباً نو سو صفحات۔ اعلیٰ ولایتی گلیزڈ کاغذ۔ بمضبوط دحسین جلد مع گرد پوش۔ قیمت بیس روپے

ابلیس و آدم از پرویز سلسلہ معارف القرآن کی پہلی جلد جسے نظرثانی کے بعد شائع کیا گیا ہے۔ انسانی تخلیق۔ قصہ آدم، جنات، ملائکہ، وحی وغیرہ جیسے اہم مباحث کی حامل۔ بڑی تقطیع کے ۳۰۰ صفحات۔ قیمت آٹھ روپے

قرآنی دستورِ پاکستان از پرویز اس میں پاکستان کے لئے قرآنی دستور کا خاکہ دیا گیا ہے اور حکومت، علماء، اور اسلامی جماعت کے مجوزہ دستوروں پر تنقید کی گئی ہے (دو سو چوبیس صفحات، قیمت دو روپے آٹھ آنے۔

اسلامی نظام اسلامی مملکت کے بنیادی اصول کیا ہیں۔ اور اسلامی نظام کیسے قائم ہو سکتا ہے اس کے جواب میں جناب پرویز اور علامہ اسلم جیراجپوری کے مقالات۔ جنہوں نے فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دی ہیں ۱۸۰ صفحات قیمت دو روپے

سلیم کے نام (از پرویز) نوجوانوں کے دل میں اسلام سے متعلق جو شکوک پیدا ہوتے ہیں۔ ان کا شگفتہ اور مدلل جواب۔ بڑے سائز کے ۴۰۸ صفحات قیمت چھ روپے

اسبابِ زوالِ امت مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ میں پہلی مرتبہ بتایا گیا ہے کہ ہمارا مرض کیا ہے اور علاج کیا؟ ۱۴۸ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

جشن نامے ایسے عنوانات، جنہیں پڑھ کر ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی ہو اور آنکھوں میں آنسو۔ طنز اور تنقید کے گہرے نشتر۔ سات سالہ دورِ آزادی کی کہی ہوئی تاریخ۔ ۲۵۶ صفحات۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے (تمام کتابیں مجلد ہیں اور گرد پوش سے آراستہ۔ محصول ڈاک ہر حالت میں بذمہ خریدار)

ملنے کا پتہ:۔ **ناظم ادارہ طلوعِ اسلام پوسٹ بکس نمبر ۱۳۱۷ کراچی**